# فہرست مضمون نگاران معارف

## جلد ۵۵

## جنوری سنہ ۱۹۴۵ء تا جون سنہ ۱۹۴۵ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)



### شعراء

# فہرست مضامین

## جلد ۵۵

## جنوری ۱۹۴۵ء تا جون ۱۹۴۵ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)



---



جلد ۵۵ ماہ محرم الحرام ۱۳۶۴ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۴۵ء عدد ۱

## مضامین



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# شذرات

مالوہ کی ریاست دھار کا علاقہ نویں اور دسویں صدی ہجری میں تقریباً دو صدیوں تک اسلامی حکومت کا مرکز رہ چکا ہے، اور وہاں مالوہ کے خلجی سلاطین، اور ان کے جانشین دوسرے مسلمان فرمانرواؤں کی بہت سی تاریخی عمارتیں ہیں، جو محکمۂ آثار قدیمہ کی نگرانی میں ہیں، ان میں خلجی سلاطین کی تعمیر کردہ ایک جامع مسجد ہے، اس سے متصل سلطان محمود خلجی المتوفی ۸۷۳ھ کا مقبرہ ہے جس میں اس کے قریب زمانہ کے ایک اور بزرگ شیخ سعد اللہ المتوفی ۹۰۲ھ بھی محو خواب ہیں، اس کے دوسری سمت ایک دوسرے بزرگ مولانا کمال الدین کا مقبرہ ہے، ان کے علاوہ مسجد کے آس پاس اور بہت سے مقابر و مزارات ہیں، ریاست دھار اور محکمۂ آثار قدیمہ دونوں نے جامع مسجد میں مسلمانوں کا نماز پنجگانہ ادا کرنے کا حق قائم رکھا ہے، اور وہ برابر اس میں نماز پڑھتے چلے آتے ہیں،

---

ہم کو دھار کی ایک اطلاع سے معلوم ہوا ہے کہ آج سے آٹھ دس سال پیشتر بعض شرارت پسند اشخاص نے مسجد کمال مولیٰ شامل

بنانے کی تحریک اٹھائی تھی، جو ریاست کی انصاف پسندی اور عاقبت اندیشی سے کامیاب نہ ہو سکی، اور ۱۹۳۵ء مین اوس نے مسجد کی حیثیت اور مسلمانون کے حقِ نماز کو قانونی طور سے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا تھا، معلوم ہوا ہے کہ اب پھر یہ فتنہ انگیز تحریک اٹھائی گئی ہے، اور اس سلسلہ مین گذشتہ نومبر کو دھار کے ہندو مسلمانون مین فساد بھی ہوا جس مین ریاست کے حکام کا رویہ مسلمانون کے لئے ناقابلِ اطمینان تھا، اور ان کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے، کہ یہ مسجد بھوج شالہ کی شکل نہ اختیار کرلے، ہم کو ریاست دھار کی عاقبت اندیشی سے امید ہے کہ وہ ۱۹۳۵ء کے منصفانہ فیصلہ کے مطابق مسجد کی حیثیت اور اس مین مسلمانون کے حقِ نماز کو قائم رکھے گی، اور اس مین کسی ایسے تغیر کو روا نہ رکھے گی، جس سے کسی نئے فتنہ کا دروازہ کھل سکے، بلکہ آثارِ قدیمہ کا مقصد قدیم تاریخی عمارتون کا تحفظ ہے اس لئے مذکورۂ بالا مسجد مین اس کے قانون کی رو سے بھی کوئی تغیر نہین کیا جاسکتا،

---
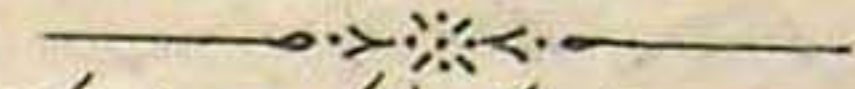
آنریبل پرشوتم داس ٹنڈن ہندی ساہتیہ سمیلن کے پرجوش رکن ہین، اس لئے ان کی ہندی نوازی محل تعجب نہین اب انھون نے ہندی کی حمایت کا ایک نیا اور اچھوتا پہلو پیدا کیا ہے، اور منطقی استدلال سے سوراج کا ہندی زبان سے تعلق ثابت کر دکھایا، چنانچہ آل انڈیا ہندی جرنلسٹ کانفرنس کانپور کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا ہے، کہ "ہندی قومیت ہے، قومیت کانگریس ہے، اور کانگریس سوراج ہے، (لیڈر ۲۵ دسمبر ۱۹۴۴ء) گویا دوسرے الفاظ مین ہندی سوراج ہے، اس استدلال کے بعد کسی ہندستانی کے لئے اختلاف کی گنجائش باقی نہ رہ جاتی ہے، معلوم نہین سوراج کی اس نئی تعبیر سے کانگریس کے دوسرے ذمہ دار ارکان کو کہان تک اتفاق ہے، اگر کل کو ٹنڈن جی نے ہندو مذہب کو سوراج قرار دیدیا، تو ہندوستان کی دوسری قومون کا ٹھکانا کہان ہوگا، ٹنڈن جی کو ہندی کے پرچار کی پوری آزادی حاصل ہے، لیکن کانگریس کے ذمہ دار رکن کی حیثیت سے اس قسم کے مسائل مین کانگریس اور سوراج کو درمیان مین لانا کانگریس کے ساتھ نادانی کی دوستی ہے،

---
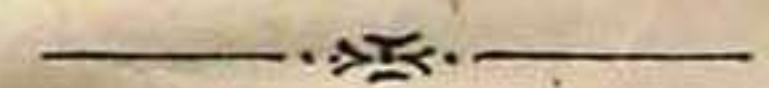
ان کے ایک دوسرے ہم مشرب مسٹر ساورکر نے ہندو مہاسبھا کے اجلاس بلاسپور مین ہندستان کی تقسیم کے جواب مین گندھار (افغانستان) کو بھی ہندوستان مین شامل کرنے کا عزم ظاہر کیا ہے، (لیڈر ۲۸ دسمبر ۱۹۴۴ء) یہ ارادہ نہایت مبارک اور تجویز بہت معقول ہے غالباً پاکستان کے حامیون کو بھی اس کے ماننے مین کوئی تامل نہ ہو، بلکہ اگر مسٹر ساورکر ایران ترکستان کو بھی جہان تک کسی زمانہ مین بدھ مذہب کا اثر پہونچا تھا شامل کرلین تو اور زیادہ مناسب ہے، لیکن اس بارہ مین ان کو پہلے مالوی جی اور ڈاکٹر مونجے سے مشورہ کر لینا چاہئے، ورنہ کہین سعدی "از دست خویشتن فریاد" کی مثل نہ صادق آجائے،

---

ناظرین کو معلوم ہے کہ معارف کی ضخامت اب کل ایک تہائی رہ گئی ہے، گو صفحات کی سطرین زیادہ کر دی گئی ہین، اور خط خفی کر دیا گیا ہے، لیکن اس سے اس کمی کی پوری تلافی نہین ہو سکی ہے، اس لئے معارف کے ابواب صفحات بھی گھٹا دینا پڑے اور اس سے متعلق مضامین، استفسارات، ادبیات و مطبوعات جدیدہ کی آمد کا سلسلہ ویسے ہی جاری ہے، اور ان کی اشاعت و جواب خصوصاً ریویو کے تقاضے کے خطوط برابر آتے رہتے ہین اس لئے گذارش ہے کہ صفحات کی کمی کی وجہ سے کچھ تاخیر ضروری ہوگی لیکن انشاء اللہ دیر سویر مضامین منظومات کی اشاعت و استفسارات کے جوابات اور کتابون پر تبصرہ ہوتا رہے گا، اور یہ جبری تاخیر قابلِ معافی تقصیر کی جائے گی،

---



# مقالات

## ہندوستان مین مسلمانون کا نظام تعلیم و تربیت

(۲)

مصنف کے نزدیک جدید و قدیم کے توازن کی شکل ہے کہ مثل سابق نصاب تعلیم مین دینیات تفسیر و حدیث و فقہ کی ایک ایک کتاب مثلاً جلالین و مشکوٰۃ و شرح وقایہ رکھکر باقی دینی کتابون کو ہٹا کر ان کی جگہ غیر دینیاتی علوم منطق و فلسفہ و ریاضی و ہندسہ و اصول و کلام و ادب کو دی جائے، ان کا منشاء یہ ہے کہ جس طرح گذشتہ اسلامی حکومتون کے زمانہ مین تعلیم کی صورت یہ تھی، کہ فارسی اور متوسطات تک تعلیم کاروباری اور مذہبی اشخاص دونون کی مشترک تھی، کاروباری، دفتر کاری ملازمت پیشہ یہان تک پہنچ کر اپنے کاروبار مین لگ جاتے تھے، اور جو باقاعدہ عالم ہونا چاہتے تھے، وہ پھر باقی علوم کی تکمیل کرتے تھے، اسی طرح اب بھی ہو سکتا ہو کہ ایک ہی نظام تعلیم و نصاب تعلیم ساری قوم مین جاری ہو جس مین ابتدائی دینی و اخلاقی تعلیم اردو و فارسی و عربی یا انگریزی اور قدیم و جدید علوم کی تعلیم متوسطات کی حد تک بشمول کتب مختصرہ تفسیر و حدیث و فقہ مشترک سب کو یکسان دی جائے، اور اس کے بعد کاروباری لوگ کاروبار مین لگ جائین، اور علوم و فنون کی تکمیل والے اپنی تکمیل کے اسباق و علوم پڑھین۔

بات کہنے مین تو صاف ہو لیکن اس کے لئے ضرورت ہے کہ گذشتہ اسلامی حکومتون اور ان کے زمانون کو بھی واپس لایا جائے یا موجودہ حکومت کو اس اصلاح کے قبول کرنے پر آمادہ کیا جائے، یا پھر نمونہ کے طور پر کوئی ایسی درسگاہ قائم کی جائے اور اس کی کامیابی کو آزمایا جائے، اور دیکھا جائے کہ مصنف نے اپنے اس نظریہ سے جو دینی و دنیاوی کامیابی وابستہ کی ہے، وہ کہان تک درست ہے، دار العلوم ندوہ مین اوس کے قریب قریب ایک طریقہ اختیار کیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ وہان عالمیت کے نام سے چھ برس کی تعلیم مشترک ہے جس مین صرف و نحو و ادب و فقہ و اصول و حدیث و قرآن پاک و عقائد اور انگریزی حساب و جغرافیہ تاریخ و جومیٹری کی تعلیم ہوتی ہے اس کے ختم کرنے کے بعد عالمیت کی سند دی جاتی ہے، اب اس کے بعد یا طالب علم یہین تین برس کی فضیلت کی تعلیم پاکر عالم ہوتا ہے، اور یا انگریزی اسکول مین داخل ہوکر کاروباری تعلیم حاصل کرتا ہے، لیکن نتیجہ اس کا یہ دیکھا گیا ہے کہ یہ چھ برس کی تعلیم اسکول جاکر بالکل دھل جاتی ہے،

اب ایک نیا نظامِ مناہج تعلیم مولانا سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی امیر جماعت اسلامی نے پیش کیا ہو، جس کو انھون نے آج سے چار سال پیشتر دار العلوم ندوہ کے ایک جلسہ مین پیش کیا تھا، اب وہ اسی اساس پر خود ایک درس گاہ قائم کرنا چاہتے ہین جس مین دینی و دنیاوی کی تقسیم نہ ہوگی، بلکہ ایک تعلیم ہوگی، اور یکسان ہوگی،

بہرحال ایک خیال ہو جب وہ مجسم ہو تو اس کا عیب و ہنر معلوم ہو، خود راقم نے ۱۹۴۲ء مین خطبۂ صدارت مجلس العلماء ترچناپلی مین جو کچھ بیان کیا ہے، اور "مسلمانون کی آیندہ تعلیم" کے عنوان سے ۱۹۳۲ء مین جامعہ ملیہ مین جو مقالہ پڑھا تھا، اور ۱۹۳۴ء مین شعبۂ علوم و فنون ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت اور ۱۹۳۶ء مین جامعہ دار السلام عمر آباد کے خطبۂ اسناد مین جو کچھ عرض کیا ہے وہ پرانے

ہونے کے باوجود بھی اس وقت پڑھنے کے قابل ہے،

مصنف نے اس کے بعد ابتدائی تعلیم کا اجمالی نقشہ کھینچا ہے، اور پانچ امور اساسی بیان کئے ہین، (۱) صرف وہی چیزین پڑھائی جائین، جو استادون سے پڑھے بغیر نہین آتین (۲) اردو کی تقویت کے لئے فارسی اور فارسی کی تقویت کیلئے عربی پڑھائی جائے (۳) صرف وہ عربی پڑھائی جائے، جس مین ہماری دینی کتابین ہین، (۴) اس عربی کو قرآنی پارون اور فقہی و حدیثی متون کے ذریعہ سے پڑھایا جائے (۵) صرفی و نحوی طول طویل مباحث کی جگہ صرف کام کے مسائل کے رسالے پڑھائے جائین، مصنف کا خیال ہے کہ ان پانچ اصولون کے زیر نظر نو سال کا کورس میٹرک تک انگریزی زبان اور حساب کے ساتھ پڑھایا جائے، اور اس کے بعد قرآن و حدیث و فقہ کی تعلیم جلالین، مشکوٰۃ اور شرح وقایہ کے ذریعہ سے بی اے تک دی جائے، اور اس کے ساتھ چار سال مین دوسرے جدید اختیاری و مناسب مضامین پڑھائے جائین، اس کے بعد ایم اے کا اختصاصی درجہ آئے گا جس مین کسی ایک مضمون کی تخصیص کی جائے گی،

مصنف نے جو کچھ اوپر فرمایا ہے اس کے رو سے جامعۂ عثمانیہ کا شعبۂ دینیات، مسلم یونیورسٹی کا شعبۂ تھیالوجی ایم اے اور ڈھاکہ یونیورسٹی کا شعبۂ اسلامک اسٹڈیز اس کے قریب کا خاکہ ہے، مصنف کا خیال ہے کہ اس وحدت تعلیم سے قدیم و جدید دینی اور دنیاوی اور علما، اور تعلیم یافتہ کے سارے فرق مراتب ختم ہو جائین گے، فنعم الوفاق،

اس کے بعد مصنف نے بعض اون علما، کا تذکرہ چھیڑا ہے، جنھون نے ہندوستان سے باہر جا کر ناموری حاصل کی اس سلسلہ کے لکھتے وقت خود مصنف کو بھی شک تھا کہ یہ بیان یہان بے محل تو نہین، مگر افادہ کا سیلاب محل اور بے محل کو نہین دیکھتا، وہ تو اپنی روانی مین آپ بہتا ہے،

آخر مین درجۂ فضیلت کی تعلیم کے متعلق گفتگو فرمائی ہے (صفحہ ۲۰۵) سے یہ گفتگو شروع ہوئی ہے، مصنف کے خیال کے مطابق اس درجہ کی تعلیم حسب ذیل چند اساسی اصول پر قائم کی گئی تھی،

۱- علوم عالیہ سے پہلے چند علوم آلیہ یعنی ورزشی علوم سکھائے جاتے تھے، یعنی ایسے علوم جن کے مسائل اور دعاوی واضح اور صاف نہ ہون، بلکہ ان مین ابہام، ہیچ اور پیچیدگی زیادہ ہو، جن کا ہر دعوی آسانی سے ثابت نہ ہو سکتا ہو، بلکہ جو کبھی بنایا جائے، وہ ٹوٹ سکتا ہو، اعتراض اور جواب کے سلسلہ کی اپنے اندر کافی گنجایش رکھتا ہو، مقصد یہ تھا کہ طلبہ مین خود سوچنے اور تنقید کرنے اور مسائل کے دقیق پہلوؤن تک پہنچنے کی مشق پیدا ہو لیکن مصنف اپنی نئی تجویز مین دوبارہ اوس کو لانے کی کوشش کر کے اپنے بیان مین تضاد پیدا کرنا چاہتے ہین،

بجز علوم نہین ان علوم آلیہ یا ورزشی علوم سے مصنف کی مراد کیا ہے، عام طور سے تو صرف و نحو اور منطق کو علوم آلیہ کہا جاتا ہے، مگر علوم آلیہ کی یہ تعریف تو ان علوم پر صادق نہین آتی، ہان یہ سچ ہے کہ ان علوم آلیہ پر جو کتابین زیر درس تھین اون کتابون مین یہ اغلاق و اجمال اور پیچیدگی اور سوال و جواب کے ایک سلسلۂ دراز کی صورت ...... موجود تھی، دوسرے قدیم علما، کی طرح مصنف کا بھی یہ خیال ہے کہ ان مغلق و پیچیدہ اور اعتراض در اعتراض کتابون کے رکھنے سے غرض محض طالب علم کے ذہن کی تشحیذ اور جولانی تھی، ہوگی، اس وقت اس کی ضرورت ہوگی، مگر اب تو وہ نقائص سے معمور ہے، اول یہ کہ طالب علم اسی اعتراض در اعتراض کی بھول بھلیون مین پھنس کر رہ جاتا ہے، اور اصل حقیقت سے کوسون دور ہو جاتا ہے، دوم یہ کہ شروع ہی سے اوس کی ذہنیت اس طریقۂ تعلیم کے بدولت کج ہو جاتی تھی، سیدھی بات بھی ان کو الٹی معلوم ہوتی تھی، ہر بحث



کو سمجھنے کے بجائے اوس کے توڑنے کی فکر غالب ہوتی ہے، سوم یہ ہر کہ فنی مسائل کے بجائے حواشی و شروح و قال اقول کو علم سمجھا جاتا ہے،

یہ علوم آلیہ اب بھی پڑھائے جاتے ہین، مگر ندوہ نے اس مین یہ اصلاح کی ہے کہ مغلق کتابون پر سہل و رواں کتابون کو ترجیح دی جائے، فن کے اصل مسائل پر زور دیا جائے، ان علوم سے جو غرض ہے، وہ حاصل ہو، شروح و حواشی تنبیہات و قال اقول سے پرہیز کیا جائے، ہم کو تسلیم ہے کہ ہمارا نیا مولوی پرانے درس یافتہ مولویون کی طرح بات مین بات اور بال کی کھال نہین نکال سکتا، اور نہ ہر سیدھی بات کو ٹیڑھے طور سے کہنے کا خوگر ہوتا ہے، اور اسی لئے وہ اس نظر سے انکے مقابلہ مین سطحی ہوتا ہے، لیکن یہ علم کے باب مین قدیم و جدید خیال کے نقطۂ نظر کا فرق ہے،

۲- دوسری اساسی بنیاد مصنف نے یہ بتائی ہے، کہ تلاش کر کے ایسی کتابین ان فنون مین رکھی جاتی تھین، جو نسبتہً تفصیل کے بجائے مجمل زیادہ ہون، عبارت اتنی سلیس نہ ہو کہ بآسانی مطلب سمجھا جا سکے، اور اوس سے مقصود ان کے خیال مین یہ تھا کہ دوسرون کی سوچی ہوئی باتون کے سمجھنے مین تعلیم سے فراغت کے بعد طلبہ کو دشواری نہ ہو،

درس نظامی مین اس قسم کی کتابون کے رکھنے کا جو حاصل بتایا گیا ہے، اس کا دوسرا مخالف رُخ دکھانا بھی ضروری ہے، اس طرز تعلیم کے عیوب یہ ہین کہ ہمارے طلبہ فن کے مسائل کے علم کے بجائے مشکل کتابون کی عبارت کے حل کرنے ہی کو علم سمجھنے لگے، فصول اکبری، شافیہ، کافیہ، ملاجامی تہذیب، سلّم اور مسلّم، میر زاہد، افق المبین مین مسائل سے زیادہ وقت عبارتون کے اجمال و اشکال کے دفع اور فقرون سے مضمون کا مطلب نکالنے مین صرف ہوتا ہے، اور اوس سے جو حاصل ہوا یعنی دقتِ نظر اوس سے عملی کام لینے کا موقع بہی ملتا ہے، کہ اسی قسم اور اسی ذوق کی کتابون کے پڑھنے پڑھانے کا کام جاری رکھا جائے، اور فن جاننے کے بجائے کتاب جاننے کا نام علم رکھا جائے، اور لفظی گورکھ دھندون مین پھنس کر پھر نہ نکل سکے،

مصنف نے اپنے خیال کی تائید مین یہان تمثیلات کے استدلال سے کام لیا ہے، مگر انہی نے ہم کو بتایا ہے، کہ تمثیل کا درجہ شاعری سے زیادہ نہین، تمثیلات اس کے خلاف بھی پیش کیجا سکتی ہین، اور اب اعادۂ معدوم انہی کے اصول پر محال ہے،

۳- مصنف نے اس تیسرے نمبر پر بحث و جدال کو رکھا ہے، جس سے ان کا مقصود یہ ہے کہ شاگرد اور استاد دونون مل کر مسائل کی تحقیق اور شبہات کے ازالہ مین زور آزمائی کرین، تا آنکہ بحث منفصل ہو جائے، بات بالکل ٹھیک ہے اور درس نظامی کے ممتاز طالب علمون کے قصون مین یہ ذکر بار بار آیا ہے، مگر افسوس ہے کہ اس بحث و جدال کی قوت بھی فن کے مسائل مین کم اور کتاب کے مطالب مین زیادہ صرف ہوتی ہے، یہ تحقیق و تدقیق کتاب کی صحت و خطا اور ایک خاص کتاب کے مصنف کے الفاظ کے در و بست کے سمجھنے کے بجائے اصل مسئلۂ زیر بحث پر صرف ہونی چاہئے، ہمارے اساتذہ مین جناب مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی، اور مولانا شبلی نعمانی کا یہی طریق تھا، وہ کتاب سے نہین بلکہ اصل مسئلہ سے بحث کرتے تھے،

حقیقت یہ ہے کہ درس نظامی کے طریق مین فن دانی سے زیادہ کتاب خوانی پر وقت صرف ہوتا تھا، اس دور سے پہلے قدما کا دستور کتاب پڑھانے جانے کے بجائے فن پڑھانے کا تھا، اور اسی کا نام طریق املا تھا، قرآن و حدیث و فقہ سے لیکر صرف و نحو وادب اور علوم عقلیہ تک اسی طرح پڑھائے جاتے تھے، اور اس طریق تعلیم کی قوت و افادہ کا حال سب کو معلوم ہے تاہم مسائل زیر درس مین طلبہ اور اساتذہ کا کبھی کبھی بحث و مباحثہ اور ازالۂ شبہات کی کوشش کی حوصلہ افزائی بہت ضروری ہے، اور تعلیم کا یہ گر جیسا کہ ابن خلدون کے بیان سے بھی مصنف نے ثابت کیا ہے، بہت مفید ہے، مگر اسی کے ساتھ بے مغزی کی گفتگو کج فہمی کی خو کی درستی، اور گفتن برائے گفتن کی عادت سے بچانا بھی بحد ضروری ہے،

۴۔ چوتھا قدیم اصول درس اعادہ و تکرار تھا، یعنی یہ طریقہ تھا کہ مدرس جب درس دے چکے، تو ممتاز طلبہ مین سے کوئی ایک استاد کی تقریر کو دوبارہ باقی طلبہ کو سمجھا جاتا تھا، یہ بیحد ضروری اور مفید اصول درس تھا، جس کو افسوس ہو کہ اب چھوڑا جا رہا ہے،

۵۔ پانچوان اصول یہ تھا کہ ممتاز طلبہ اپنی طالب علمی ہی کے زمانہ مین اپنے نیچے کے طلبہ کو پڑھایا کرتے تھے، یہ بیحد مفید طریقہ تھا اس سے دو فائدے ہوتے تھے، ایک تو یہ کہ پڑھانے والے طلبہ کی کتابین منجھتی تھین، پھر کسی چیز کو پڑھاتے وقت نفسیاتی طور سے پڑھانے والے کے ذہن پر ایسا اثر پڑتا ہے کہ وہ اس وقت وہ سمجھنے لگتا ہے، جس کو وہ پڑھتے وقت نہین سمجھ سکا تھا، یا نہین سمجھ سکتا تھی، اور دوسرا فائدہ یہ تھا کہ ہر درس گاہ مین صرف ایک دو مدرس کی، علی جماعتون کے لئے ضرورت پڑتی تھی، اور نیچے کے طلبہ اوپر کے طلبہ سے پڑھ لیتے تھے، اور اس طرح درس گاہون کے مصارف مین بہت کمی ہوتی تھی،

آجکل مدارس مین ندوہ کی مصطلح تکمیل کا جو ذوق پھیل رہا ہے، یہ بھی کوئی نئی چیز نہین، یہ وہی چیز ہے، جس کی صورت ہمارے بزرگون کے ہان یہ تھی، کہ ممتاز طلبہ فراغت کے بعد اپنے اساتذہ کے زیر نظر اور ان کی صحبت مین رہکر چند سال درس و تدریس کا کام انجام دیتے تھے، اور آخر وہ ایسے تیار ہو جاتے تھے، کہ بعد کو بڑے بڑے شہرون اور بڑے بڑے مدرسون مین جا کر اپنا حلقۂ درس قائم کرتے تھے، اور ایک عالم کو اپنے فیوض سے سیراب کرتے تھے، اب مدارس سے یہ چیز تقریباً مفقود ہو رہی ہے، اب انگریزی کی تقلید مین طالب علم امتحانات کے کاغذی اسناد کے پھیر مین مبتلا ہے، اور اسی کو حاصل علم سمجھ رہا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ سفینہ اسناد سے معمور ہے، لیکن سینہ علم سے خالی ہے، یہی سبب ہو کہ آج ہمارے عربی مدرسون مین کامیاب مدرسین کی بیحد کمی محسوس ہوتی ہے، ایک بھی کامل مدرس جب اٹھ جاتا ہے، تو دوسرا اس کا قائم مقام نہین ملتا، انگریزی تعلیم نے اس نقص کا ازالہ ٹریننگ اسکولون اور کالجون، اور ڈاکٹریٹ کے طریقہ سے کر لیا ہے، مگر ہمارے عربی مدارس مین اس کا علاج یہی ہے، کہ ممتاز طلبہ کو فراغت کے بعد روک لیا جائے، اور ان کو مزید دو تین سال پڑھنے پڑھانے اور توسیع علم، مطالعۂ کتب اور تحقیق مسائل کا موقع دیا جائے، خوشی کی بات ہو کہ اب دار العلوم ندوہ کے علاوہ بعض دوسرے مدرسون مین اس تجویز پر عمل کیا جا رہا ہے،

**جاگیرداری سسٹم** مصنف نے کتاب کے آخر مین طالب علمی کے پرانے "طریق جاگیرداری" کی حمایت کی ہے، اور اس کے لئے آیندہ کچھ زیادہ لکھنے کا وعدہ کیا ہے، اور اس کو اس زمانہ کے "فیملی اسٹوڈنٹ" کے طریقہ کا معزز نام دیا ہے، بے شبہہ ایک محدود تعداد کی حیثیت سے اس طریقہ پر عمل کیا جا سکتا ہے، مگر اس زمانہ مین اس کو اگلی سی مقبولیت حاصل نہین ہو سکتی، درسگاہون کا بڑے بڑے شہرون مین ہونا، آبادی سے دور واقع ہونا، امراء و اہل ثروت کا شہر کے دور دور مقام پر ہونا، امراء کے طریق تمدن اور طریق فکر، اور طریق معیشت اور جنس و نقد کے معیارون کے اختلاف کے سبب سے پرانا "جاگیرداری سسٹم" اب دوبارہ قائم نہین ہو سکتا، اب اس کی جگہ زیادہ آسان یہ ہے کہ وظائف نقدی کو جس پر اب عمل ہو رہا ہے وسعت دی جائے،

**امتحان** مصنف نے موجودہ امتحان کی گرانباری اور زیرباری کو جس کا ذاتی تجربہ انکو حاصل ہے پوری طرح دکھایا ہے آجکل کے ماہران تعلیم نے بھی اس مسئلہ کو اہمیت دی ہے، اور اس کے نقائص اور معائب پر بحث کی ہے، ہمارے عربی مدرسون مین جہان جدید نظام تعلیم انگریزی کی تقلید مین دوسری بلائین پھیلی ہین، اور پھیل رہی ہین، وہان ایک یہ امتحان بھی ہے،

ہمارا قدیم طریق تعلیم اس بلا سے واقف نہ تھا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب عربی طالب علم کا مقصود بھی فضل و کمال کا اکتساب نہین، بلکہ امتحان مین نمبرون کا حصول رہ گیا ہے، اس کا اثر یہ ہے کہ طالب علم سال بھر سوتا ہے، اور صرف امتحان



کے دنون مین جاگتا ہے، اور جس کو سال بھر مین لقمہ بہ لقمہ چبا کر کھانا چاہئے تھا، اس کو ایک دم ایک ساتھ اور ایک ہی مہینہ مین نگل نگل کر ہمیشہ کے لئے سوء ہضم کی بیماری اپنے معدہ مین پیدا کر لیتا ہے،

امتحان کی یہ بلا جیسا کہ مولانا شبلی فرماتے تھے، ہمارے عربی مدرسون مین دیوبند سے شروع ہوئی، اور ہر جگہ پھیل گئی، میرے خیال مین اس کی وجہ یہ ہوئی، کہ مدرسۂ دیوبند کے بانیان کرام اور ارکان عظام عموماً سرکاری مدرسون سے پہلے متعلق رہ چکے تھے، مولانا مملوک العلی صاحب مولانا یعقوب کے والد اور مولانا قاسم صاحب اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہم اللہ تعالیٰ کے استاد عربک کالج دہلی مین مدرس تھے، اور ان دونون بزرگون نے بھی اسی کالج مین تعلیم پائی تھی، اور امتحانات دیئے تھے، مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی سرکاری مدارس کے انسپکٹر تھے، خود مولانا یعقوب صاحب مدرس اول دیوبند سرکاری مدارس کے انسپکٹر رہے تھے، اس لئے ان جدیدیات کی بعض باتین جن مین سے ایک امتحان بھی ہے، ان مقدس ہاتھون سے عربی مدارس مین داخل ہو گئین،

یہ بے شبہہ صحیح ہے کہ امتحان یا کسی اور معیار کے کلیۃً نہ ہونے کے سبب سے پچھلے زمانہ مین بلا امتیاز ہر قسم کے طالب علم ایک ہی درجہ مین یکسان پڑھتے چلے جاتے تھے، مگر اس تدبیر سے اس بیماری کا علاج کسی طرح مفید نہین، چنانچہ یہ اختلاط و عدم امتیاز اگر پہلے بے قاعدہ تھا، تو اب باقاعدہ ہے، موجودہ امتحان ایک گر ہے، جو طالب علم اس کو جانتا ہے، یا جان گیا ہے، وہ بے پڑھے بڑھتا چلا جاتا ہے، اور جو نہین جانتا وہ جاننے پر بھی گر جاتا ہے، پھر اس امتیاز کے جاننے کے لئے جس قدر وقت، روپیہ اور محنت اور کاغذ صرف کیا جاتا ہے، اس کا حاصل صرف اس قدر ہے کہ کچھ پاس ہون اور کچھ فیل ہون، حضرات ممتحنین کی سہل انگاریان اور تشدد آمیزیان دونون کے نتائج ہر سال سامنے آتے ہین، اور جن معیارون سے طالب علمون کو جانچا جاتا ہے، اور ان کی قسمت کا فیصلہ کیا جاتا ہے، اور فضل و کمال اور استعداد و عدم استعداد کو ہندسی رقمون کے ذریعہ سے تولا اور ناپا جاتا ہے، وہ تمام تر اجنبی اشخاص کے ذاتی میلان کا نتیجہ ہوتا ہے، اسی لئے ایک ہی کاپی کا نمبر دو ممتحن دو دے سکتے ہین، اور دیتے ہین،

ہمارا پرانا طریقہ یہ تھا کہ خود استاد اپنی معرفت اور تجربہ سے ہر طالب علم کو خوب جانتا اور سمجھتا تھا، اور اپنے ہر طالب علم کو ایک دن کے امتحان کے بعد نہین، بلکہ تین سو ساٹھ دنون کے امتحان سے اچھی طرح سمجھ لیتا تھا، اور ہر ایک کا مخصوص علاج اپنے روزانہ کے اسباق مین کرتا رہتا تھا، ہم نے ندوہ مین خود مدرسین کے زیر نگرانی اسی لئے ماہوار امتحانون کے سلسلہ کا آغاز کیا ہے، اور انہی کو معیار بنایا جا رہا ہے،

**درجہ بندی** انگریزی کی تقلید مین عربی مدارس مین دوسری بلا درجہ بندی کی پھیل رہی ہے عربی مدرسون مین یہ بلا سب سے پہلے دار العلوم ندوہ سے شروع ہوئی، جس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے مدرسون مین طالب العلمی ایک طرح سے پیشہ اور ذریعۂ رزق بن گئی تھی، بڑے بڑے طالب علم اپنی پوری عمر مدرسہ کی روٹیون پر ایک کتاب سے دوسری کتاب اور دوسری کتاب سے تیسری کتاب، اور پھر چوتھی کتاب پڑھنے مین صرف کر دیتے تھے، اور فراغت نہین پانا چاہتے تھے، اس کا اندازہ آپ کو بھوپال کے سرکاری عربی مدرسون کی اس روداد اور مولانا شبلی مرحوم کی اصلاحیات سے ہوگا، جس کو حیات شبلی مین قصداً شائع کر دیا گیا،

اس درجہ بندی سے اس طالب علمی کے مرض کا تو سد باب ہو گیا، مگر اس سے اور امراض پیدا ہو گئے، یعنی کہ ایک ہی درجہ مین ناقص و کامل غبی و ذہین، اور چھوٹے اور بڑے طالب علمونکو ایک ہی مدۃ معینہ کے اندر متعینہ کتابون کو ختم کرنا ضروری ہے،

حالانکہ یہ علانیہ فطرت سے اعلان جنگ ہے، نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف ذہین غبی کے سبب اپنے وقت کے ضائع کرنے پر، اور غبی ذہین کے سبب بے سمجھے بوجھے تیز قدم بڑھانے پر مجبور ہوتا ہے،

دوسری خرابی یہ ہے کہ ہر طالب علم کو خواہ اوس کا ذوق کچھ ہی ہو، اور اس کا میلان طبع کسی طرف ہو، اوس کو زبردستی درجہ کے متعینہ علوم و فنون پڑھنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے، حالانکہ پڑھنے کے بعد بھی وہ ان سے کورا ہی رہتا ہے، اگر درجہ بندی نہ ہوتی جیسا کہ پہلے تھا، تو فرداً فرداً ہر طالب علم کو اپنے مذاق اور میلان کے مطابق مختلف علوم و فنون مین انتخاب کا موقع رہتا، اور خاطر خواہ فائدہ ہوتا، اور بے توجہی کے ساتھ بے مذاق اور بے میل کتابون کے پڑھنے کا بار جو اس پر عائد ہوتا ہے، وہ اس پر نہ ہوتا،

امتحان اور درجہ بندی سے مل کر جو بلائے عظیم آئی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر ایک کتاب مین بھی ۳۳ کی مقدار مبرم سے چند نمبر کم آگئے تو اس کی ساری کتابون کی کامیابی حرف غلط کی طرح مٹ گئی، اور اس کی عمر کا ایک سال ضائع کر دیا گیا، اکثر دیکھا گیا ہے کہ ان ناکام لڑکون کا یہ امتحان ہی نہیں بلکہ تعلیم ہی ناتمام رہ جاتی، اور عمر ہی ناکام ہو جاتی ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ درجۂ اخیر کے علاوہ نیچے کے درجات مین مدرسین کے ماہانہ امتحانات کے نتیجہ کو فیصلہ مین اہمیت دی جائے،

**ہمارے عربی مدارس مین قلبی مرض النوم**

مصنف نے اپنے مقدمہ میں قلبی تنوم کے نام کی بیماری کا تو تذکرہ کیا ہے، مگر اوس کی تفصیل اور تشریح اور علاج کا ذکر نہیں کیا ہے، شاید آیندہ کرین،

عربی مدارس کی بنا خالص دینی و مذہبی غایت پر رکھی گئی تھی، مگر جیسے جیسے انگریزی مدارس کی پیروی میں جدید اصلاحات مدرسون مین پھیل رہے ہین انگریزی کالجون اور اسکولون کی ہر چیز کی ارادی اور غیر ارادی نقالی کی بلا بھی عام طور سے پھیل رہی ہے، یہان تک کہ بڑے بڑے عربی مدرسون تک مین یہ بلا پہنچ گئی ہے، دین کا جذبہ مفقود ہو رہا ہے، اساتذہ کی عزت اور قدر بڑون سے رخصت ہو رہی ہے، کسب کمال کی جگہ کسب مال کا جذبہ بڑھ رہا ہے، عمق اور گہرائی کی جگہ سطحیت آ رہی ہے، اور حریت و آزادی کا جھوٹا طوفان اس قدیم طریق نظم و نسق کو جو بزرگون کے احترام اور خوردون پر شفقت پر قائم تھا، یا تو بالکل مٹا چکا، یا مٹا رہا ہے، الزام خورد و بزرگ کو اور بزرگ خورد کو دے رہے ہین، اور دونون ہی الزام صحیح ہین کیونکہ یہ اصول دونون طرف سے یکسان ہی برتے، اور توڑے جا سکتے ہین، اس سے زیادہ قابلِ افسوس حالت یہ ہے کہ ہمارے عربی مدرسے بے مقصد ہو رہے ہین اور اکثر کی بنا للّٰہیت کے بجائے پیٹ پر ہے، کہین اہل حدیث و حنفیت کے دنگل پڑ رہے ہین، کہین سرکاری امتحانات کے میلان کو بڑھایا جا رہا ہے، کہین مولوی کی جگہ پر مولوی بنانے کی تیاری ہو رہی ہے، کہین انگریزی اسکولون اور کالجون مین داخلہ کی تیاری ہے، مگر دین کا ولولہ، دین کی خدمت، ایمان کامل، حصول دین کی خدمت علم، نفع کا سوال، اور عمل صالح کا خیال قلوب سے محو ہو رہا ہے، مدرسین مین بھی اخلاص و قناعت کی جگہ جو ہمارے علمائے کا جوہر تھا، داد و ستد، ہر گریڈ اور ترقی اور عہدہ اور منصب و نفلی اعزاز و اکرام کے حصول کا شوق نمایان ہے، پرنسپل، اور پروفیسر اور لکچرر بننے اور کہنے اور کہلانے پر مٹ رہے ہین، فانی تسخیرون طلبہ مین انگریزی طالب علمون کی نقالی مین آرایش و نمایش اور فیشن اور مال کی خدمت اور کپڑون کی نئی تراش و خراش اور ظاہری ٹیپ ٹاپ اور سیر تماشا کا شوق اتنا نمایان ہے کہ اس کے نیچے علم کی سچی طلب یون سے رخصت ہو رہی ہے، ہم جن باتون کا الزام کبھی انگریزی طالب علمون کو دیتے تھے اب ان مین سے ایک ایک عربی طالب علمون میں پایا جاتا ہے، اگر کمی ہے تو اس لئے کہ ہمارے طالب علمون کے پاس وافر روپیہ نہیں، صحبت نبی از بے جا دری کیا یہ امور ہمارے علما کے سوچنے اور غور کرنے کے قابل ہین، ان صفحات مین کتاب کے اہم مباحث پر اجمالی گفتگو کی گئی ہے، لیکن مصنف کا قلم چونکہ منطقی ترتیب اور مصطلح تعریفی رسوم کے بجائے افادیت کا خوگر ہے، اس لئے کتاب مین ضمناً بہت سے معلومات فوائد، اور مباحث بھی آگئے ہین جن کا علم بجائے خود مفید ہے، اور ہم کہہ سکتے ہین کہ ہمارے قدیم طریقۂ تعلیم اور اصول تعلیم پر اس سے زیادہ جامع کتاب نہیں لکھی گئی، مگر ضرورت تھی کہ جامع کے ساتھ مانع بھی ہوتی، ان معلومات و نتائج کو سامنے رکھکر آیندہ تعلیم کا نقشہ بنایا جا سکتا ہے،



# مقبرۂ ابو الحسن تربتی

از

جناب محمد شجاع الدین صاحب ایم اے، لاہور

بیا و نقش عماراتِ شہریاران بین

کہ این سپہرِ جفا پیشہ چون ببست و شکست

عہد مغلیہ مین اکثر باکمال ایران خراسان اور توران وغیرہ ممالک سے تلاشِ روزگار کے سلسلہ مین واردِ ہندوستان ہوا کرتے تھے، اور ان کی قسمت کا ستارہ فضائے ہند مین چمک کر شام غربت کو صبحِ وطن سے زیادہ تابناک بنا دیتا تھا، اکثر کا بخت رسا انھین سپہ سالاری صوبہ داری اور وزارت عظمیٰ کے عہدون تک پہنچا دیتا تھا، علما ہون یا شعرا، ماہرانِ انتظام ملکی ہون، یا نبرد آزمایانِ جنگی، ہر جوہر قابل کے لئے سرزمین ہند مین شان کئی موجود تھی، یہ الگ بات ہے کہ بعض تیرہ بختون کا حال "مخفی رشتی" جیسا بھی ہوتا ہو،

بہرکیف ابو الحسن تربتی کو آب و دانہ اور خاک گور اس کے وطنِ مالوف تربت حیدری سے اکبر اعظم کے عہد مین ہندوستان کھینچ لائی، تربت حیدری اُن دنون خراسان کا مشہور اور مردم خیز شہر تھا، اور آج بھی مملکت ایران کے شمال مشرقی حصہ مین صوبۂ خراسان کے دار السلطنت حضرت امام رضاؑ کے مشہد مقدس سے جنوب کی سمت مائل بمغرب تقریباً ۵۰ میل کے فاصلے پر آباد ہے، اور ایک متوسط درجے کا قصبہ ہے،

جوہر شناس اکبر نے ابو الحسن کو ہاتھون ہاتھ لیا[1]، اور دکن کے نو مفتوحہ علاقون کا دیوان مقرر کیا، اکبری دور کی دکنی مہم ۱۰۰۸ھ مین احمد نگر اور ۱۰۰۹ھ مین اسیر گڈھ کی فتح کے بعد مکمل ہوئی، چنانچہ اسی زمانے مین ابو الحسن یہان آیا، اس کے آبا و اجداد اس کی ابتدائی زندگی اور تعلیم و تربیت کے متعلق ہم کوئی واقفیت نہین رکھتے، لیکن اس کی کامیاب زندگی بڑے عہدون کے فرائض کی خوش اسلوبی سے بجا آوری یہ ظاہر کرتی ہے، کہ وہ کسی اچھی کان کا بے بہا لعل اور کسی بلند فلک کا درخشان ستارہ تھا، ابو الحسن پانچ چھ سال تک بطور دیوانِ دکن اپنے فرایض منصبی کو جانفشانی اور تندہی سے بجا لاتا رہا، دورِ جہانگیری کے دوسرے سال جب آصف خان میرزا جعفر کو وکیلِ سلطنت کا عہدہ تفویض ہوا، تو یہ اس کا سررشتہ دار بنایا گیا، اور ۱۰۲۱ھ مین میر بخشی کے عہدے پر فائز کیا گیا، اعتماد الدولہ کی وفات کے بعد ابو الحسن اس کی جگہ دیوانِ کل مقرر ہوا، اُسے پانچ ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار کا منصب عطا ہوا، جلوس جہانگیری کے انیسوین سال دیوانی کا عہدہ نورجہان کے بھائی آصف خان کو، اور کابل کی صوبہ داری ابو الحسن تربتی کو مرحمت ہوئی، مگر یہ خود دربار ہی مین رہا، اور اپنے فرزند احسن اللہ ظفر خان کو نائب مقرر کرکے کابل روانہ کیا، مہابت خان کے ہنگامے مین ابو الحسن نے نہایت دلیری اور اولوالعزمی سے ملکہ نورجہان کی حمایت مین جنگ کی اور دریائے جہلم مین ڈوبتا ہوا بمشکل بچا،

---

[1] مآثر الامرا، جلد اول صفحہ ۳،

شاہجہان کے عہد مین اُسے چھ ہزار ذات اور چھ ہزار سوار کا منصب عطا ہوا، ۱۶۲۲ء مین ابوالحسن کو کشمیر کا صوبہ دار بنایا گیا، مگر یہان بھی اُس کا فرزند ظفر خان ہی باپ کا نائب بن کر گیا، اور وہ شاہی دربار مین رہا، اس واقعہ کے ایک سال بعد ۱۶۳۳ء مطابق ۱۰۴۲ھ مین ابوالحسن تربتی ستر سال کی عمر مین راہیِ ملک عدم ہوا، صاحب مآثر الامراء اس کے فرزند ظفر خان کے حالات مین لکھتا ہے[49] کہ

"در لاہور بساط ہستی در نوردہ در مقبرۂ پدر مدفون گشت"۔

اس سے معلوم ہوا کہ ابوالحسن تربتی کا لاہور مین مقبرہ تھا جس مین اس کا فرزند ظفر خان بھی دفن ہوا،

دورِ مغلیہ مین دستور تھا، کہ جو غیر ملکی یہان آکر شاہی ملازمت کے سلسلہ مین منسلک ہوتے، وہ پھر اپنے وطن واپس نہ جا سکتے تھے، اور اس صورت مین ان کو اپنی کل دولت یہین چھوڑنا پڑتی تھی اس لئے وہ ہندوستان ہی کے کسی شہر مین عمارتین بنوا کر اقامت اختیار کر لیتے تھے، اگرچہ سرکاری خدمات کی ادائیگی کے سلسلے مین انھین مختلف شہرون مین پھرنا پڑتا تھا، مگر پیرانہ سالی کا زمانہ اور ایام تعطیلات بسر کرنے کے لئے اسی شہر مین آجاتے جسے اپنا مستقر قرار دے کر عمارتین بنوائی ہوتین، لاہور کی آب و ہوا دہلی اور آگرہ سے بہتر اور ایران و خراسان سے مقابلۃً نزدیک تر ہونے کی وجہ سے اکثر غریب الوطن اُمرانے اسی شہر کو اپنا وطن قرار دیا تھا، اور یہان فلک بوس محلات رشک فردوس باغات اور عالیشان مساجد اور مقابر بنوا کر اس شہر کی گوناگون خوبیون کو چار چاند لگا دیئے تھے، موسم گرما بسر کرنے کے لئے لاہور کے پاس ہی کشمیر کی حسین سرزمین تھی، مگر اس تمام سامانِ تعیش کے باوجود جو انھین میسر ہوتا تھا وطن کی یاد ان کے دل سے نہ جاتی تھی، اور ہندوستان میں بادشاہی کرنے کے باوجود خراسان و ترکستان کا گدا بننے کی خواہش ان کے دل مین چٹکیان لیتی تھی، جیسا کہ خود ابوالحسن تربتی کے فرزند ظفر خان احسن کے ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے،

| | |
|---|---|
| زبعد اکبرآباد است لاہور | کہ در خوبی بعالم گشتہ مشہور |
| برون آرد ہوایش از فراقت | دہد یاد از خراسان و عراقت |

(۲)

| | |
|---|---|
| الٰہی تا بود کشمیر آباد | تو از باغ خراسانم مدہ یاد |
| بہر کس ہر چہ خواہد بے سخن دہ | مرا کشمیر و بلبل را چمن دہ |

چنانچہ بہت سے مقامی اور غریب الدیار امراء کی سربفلک عمارتون نے اس شہر کو عروس البلاد بنا دیا تھا جن مین ملا نظام الدین تجنشی، شیخ فرید بخاری، امانت خان خوافی، آصف خان، علی مردان خان، علامی افضل خان، نواب میان خان، وزیر خان وغیرہ جیسے جلیل القدر امراء شامل تھے، ابوالحسن تربتی بھی جب ہندوستان آیا، تو اس نے بھی اسی شہر مین عمارتین بنوائین جو مغل امراء کے مشہور محلہ مغل پورہ مین واقع تھین، اور اسی جگہ اس کا مقبرہ بھی تھا،

اس وقت لاہور مین مقبرہ ابوالحسن کے نام سے کوئی عمارت نامزد نہین لیکن لاہور کی قدیم یادگارون کے متعلق پچھلی صدی کی لکھی ہوئی کتابون مین اس کا ذکر ملتا ہے، صاحب تحقیقاتِ چشتی[50] اپنی کتاب مین ابوالحسن کے مقبرے کا ذکر تو

---

[49] مآثر الامراء جلد دوم ص ۶۵، [50] تحقیقاتِ چشتی صفحہ ۵-۳۰۷، یہ کتاب مولوی نور احمد چشتی نے جو لاہور کے ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، انگریز حکام کے ایما پر ۱۸۶۷ء میں لکھی تھی، اس مین اُن تمام قدیم یادگارون کے حالات درج ہین، جو مؤلف کے



کرتے ہیں، مگر کسی جگہ اس کو ابوالحسن آصف خان برادر نورجہان سے خلط ملط کیا ہے، اور کہین ان کا فرزند بتایا ہے، ایک جگہ البتہ اس کی وضاحت کر دی ہے کہ یہ ابوالحسن آصف خان سے علٰحدہ کوئی اور ابوالحسن تھا، غرض

ع شد پریشان خواب من از کثرت تعبیرہا

رائے بہادر کنہیا لال[51] کایستھ کے بیان کے مطابق صاحب مقبرہ ابوالحسن یوسف خان طہرانی نورجہان کے ماموں تھے، سید محمد لطیف صاحب بھی اس مقبرے کا ذکر کرتے ہین، وہ لکھتے ہین کہ یہ ابوالحسن، ابوالحسن آصف خان برادر نورجہان سے علٰحدہ کوئی اور شخص تھا، مگر چشتی اور لطیف مین سے کوئی صاحب اس امر کی توضیح نہین کرتے ہین، کہ یہ ابوالحسن، رکن السلطنۃ خواجہ ابوالحسن تربتی تھے، مگر جب یہ تمام مورخ مقامی روایات کی بنا پر ایک مقبرے کو ابوالحسن سے منسوب کرتے ہین، اور مآثر الامراء جیسی معتبر کتاب مین خواجہ ابوالحسن تربتی کے مقبرے کا لاہور مین واقع ہونا تحریر ہے، تو اس مقبرہ ابوالحسن کو خواجہ ابوالحسن تربتی کا مقبرہ قرار دینے مین کیون شک و شبہہ کیا جائے، ذیل مین اس مقبرہ کا حال بالترتیب قلمبند کیا جاتا ہے،

۱۰۴۲ھ مین ابوالحسن اس دارِ فانی سے رخصت ہوا، اور شاہجہانی عہد کے لاہور کے خوب ترین علاقے یعنی محلہ مغل پورہ مین ایک عالیشان مقبرہ اُس کی آرامگاہ قرار پایا، یہ ظاہر نہین ہوتا کہ یہ مقبرہ علی مردان خان کی طرح وہ اپنی زندگی مین خود تعمیر کرا چکا تھا یا بعد مین بنوایا گیا، خان مذکور کے مقبرے کی طرح یہ بھی اندر سے دو منزلہ تھا اور چارون طرف آٹھ کرے تھے جن کی چھت پر خوبصورت چھوٹے گنبد، اور ان کے درمیان مین بڑا گنبد تھا، جن پر سنگ سرخ لگا ہوا تھا، مقبرہ میں اندر اور باہر نہایت اعلیٰ قسم کی پچی کاری، گلکاری اور کاشی کاری تھی، مقبرے کے گرد ایک باغ تھا، اور اس باغ کو سیراب کرنے کے لئے اتنا بڑا کنوان تھا، جس پر دس رہٹ بآسائش و فراغت چل سکتے تھے، مقبرہ مذکور کے نیچے ایک وسیع تہخانہ تھا، جو اندر ہی اندر کنوین تک آیا ہوا تھا، اور کنوین مین اس کی کھڑکی بھی تھی، مولوی نور احمد معمر لوگون کی زبانی لکھتے ہین، کہ اس وسیع تہخانے کے اندر بھی گلکاری کی ہوئی تھی[52]،

اسی باغ مین مذکورۂ بالا مقبرہ کے شمالی جانب ایک اور میانہ کاشی کار گنبد تھا، اس مین ابوالحسن کی بیوی مخدومہ بیگم تہِ خاک محوِ خواب تھی، اوس نے یہ مقبرہ اپنی زندگی مین خاوند کی وفات کے بعد بنوایا تھا اور اس کا ادب ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اپنا مقبرہ بہت چھوٹا بنوایا، مخدومہ بیگم اس زمانے کی دیگر خاندانی بیگمات کی طرح بہت ہی قابل اور فاضل خاتون تھی، دیگر علوم و فنون کے علاوہ فنِ شعر گوئی مین بھی دسترس رکھتی تھی، ابوالحسن تربتی جیسے امیر کی بیوی اور ظفر خان احسن جیسے شخص کی مان کو ایسا ہی ہونا چاہئے تھا، مخدومہ بیگم نے بروز دوشنبہ بتاریخ ۹ شعبان ۱۰۵۷ھ مین اس عشرت کدۂ فانی کو الوداع کہی ظفر خان احسن ۱۰۸۳ھ مین عالمگیر کے عہد حکومت مین فوت ہوا اور اسی جگہ باپ کے پہلو مین دفن کیا گیا، ہو سکتا ہے کہ ظفر خان احسن کی بیوی بزرگ خانم بنت سیف خان (جو کہ ممتاز زمانی زوجہ شاہنشاہ شاہجہان کی بڑی بہن ملکہ بانو کی لڑکی تھی) بھی اسی خاک کا پیوند بنی ہو، اور اپنی ساس کے پاس دفن ہوئی ہو، مخدومہ بیگم نے اپنی زندگی مین اپنے جلیل القدر فرزند کے ایما سے اس مقبرے مین ایک مدرسہ قائم کر کے بہت سی جائداد

---

(بقیہ حاشیہ ص ۸) زمانے میں شہر لاہور کے باہر موجود تھیں، چونکہ یہ کتاب محض باخبر لوگون اور مجاورون کے بیانات سے ترتیب کی گئی تھی، اس لئے اس میں تضاد بیان بہت زیادہ ہے، تاہم اس سے لاہور کے متعلق بہت سی بے بہا اور دلچسپ معلومات حاصل ہوتی ہین [51] تاریخ لاہور (مطبوعہ ۱۸۸۴ء) ص ۲۴۲ و ۲۴۳ [52] لاہور (بزبان انگریزی مطبوعہ ۱۸۹۲ عیسوی) صفحہ ۱۵۲،

وقف کی تھی، مدرسہ کے طلبہ اور اساتذہ مقبرے کی جملہ عمارات مین رہتے تھے، ان کے تمام اخراجات اوقاف کی آمدنی سے پورے ہوتے تھے، اس مدرسہ مین تمام دینی اور اس زمانہ کے مروجہ علوم سکھائے جاتے تھے، اور اس عہد کے لاہور کے دوسرے مدارس کی طرح اس میں بھی دور دور سے طلبہ آتے تھے، ایک ہزار نغز خوان قاری[۴۹] نواب کی قبر پر شب و روز قرآن خوانی کے لئے مقرر ہوئے،

اس مقبرے اور باغ کے پاس ہی نواب کے عالی شان سنگین اور کاشی کار محلات تھے، جن کے ساتھ دیگر امراء کے ایوانات، مقابر اور باغات کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا، بازار دن کی رونق، محلات کی شان و شوکت، دولت و ثروت کی افراط اور تجارت و صنعت کی برکات کی وجہ سے یہ محلہ مغل پورہ لاہور کے تمام محلون سے گوے سبقت لے گیا تھا، اور اس کی گلی کوچوں مین تہذیب و تمدن بستا تھا،

ذرا چشم تصور سے ملاحظہ فرمائیے کہ فلک بوس محلات، عالی شان مساجد اور جنت نظیر باغات کے حامل اور پاکیزہ محلہ مین ایک فرحت افزا مقام تھا، جس مین کاشی کار دیوارون، سنگ سرخ کے فرشون اور سرخ پتھر کے گنبدون والے مکان کے اندر ایک پرطرب اور رنگین ماحول مین طلبہ تمام تفکرات سے بے نیاز ہو کر تحصیل علوم مین مشغول رہتے تھے،

شہنشاہ فرخ سیر اور محمد شاہ کے عہد مین جب غازی عبد الصمد خان اور نواب زکریا خان دونون باپ بیٹے یکے بعد دیگرے ناظم لاہور کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے، تو اس مدرسہ کی شہرت کو چار چاند لگ گئے، اس کے قریب ہی بیگم پورہ کے فلک رفعت محلات مین ان کا قیام تھا، انھون نے اس دار العلوم کی سرپرستی قبول کی، اور ہمیشہ طلبہ اور اساتذہ پر انعامات و اکرامات کی بارش کرتے رہتے تھے، اس زمانہ میں اس مدرسہ کے مدرس اعلیٰ حضرت حامد قاری تھے، یہ بزرگوار اس مبارک زمانہ کے جید علماء مین سے تھے، تبحر علمی کے علاوہ قدرت کی طرف سے انھین لحن داؤدی بھی عطا ہوا تھا اور ان کے زہد و تقویٰ کا ایک عالم معترف تھا،

جب تک سرزمین پنجاب اسلامی حکومت کے سایۂ عاطفت مین رہی، اس مقبرے کی رونق اور آبادی قائم رہی، لیکن جب نا اتفاقی اور دون ہمتی کے سبب ہندی مسلمانون کی سطوت اور ثروت، نکبت و عسرت مین بدل گئی، تو ان کی ہیبت سے لرزہ بر اندام رہنے والے اسلامی حکومت کی لاش کے گرد بھوکے گدھون کی طرح منڈلانے لگے، اس پر مستزاد یہ ہوا کہ درانیون کے بیرونی حملون نے پنجاب کی مسلم حکومت کی رہی سہی طاقت کو بھی ملیامیٹ کر دیا، اور یہان سکھون کا اقتدار قائم ہو گیا، اس گیرو دار مین جہان شہرون کی اینٹ سے اینٹ بج گئی، اور بے گناہ مسلمانون کے خون سے پنجاب کی سرزمین لالہ زار ہو گئی، وہان مقبرے اور مدرسے بھی اس کی زد مین آ گئے، اور اٹھارہوین صدی کے آخری ربع مین محلہ مغل پورہ کے ساتھ ہی یہ مدرسہ بھی ختم ہو گیا،

رنجیت سنگھ کے عہد مین نواح لاہور کی تمام اسلامی یادگارون سے سنگ مرمر اور دیگر قیمتی پتھر نوچ لئے گئے، اور انھین دربار صاحب امرتسر اور دوسری عمارتون کی تعمیر مین خرچ کیا گیا، مفتی غلام سرور[۵۰] مرحوم کا بیان ہے، کہ اس پر آشوب دور مین دو ہزار کے قریب مقبرے، مسجدین اور دیگر اسلامی یادگارین تباہ و برباد ہو گئین، بہت سی یادگارین پتھر اتارتے ہوئے گر گئین اور بقیہ عمارات جن مین مسجدین، مقبرے، حمام، سرائین اور حویلیان وغیرہ سب شامل تھین، حکومت کے قبضے مین تھیں، اور ان مین سے کسی میں چھاؤنی تھی، کسی مین

۴۹ یہ بیان تحقیقات چشتی کا ہے (ص ۸۰۳) جو مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے، تاہم اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بہت سے حافظ اور قاری باری باری سے قرآن شریف کی تلاوت کے لئے ملازم رکھے گئے ہون گے ۵۰ تاریخ مخزن پنجاب (۱۸۶۵ء) ص ۲۰۰،



سرکاری گودام یا کارخانہ، کسی مین گولہ بارود کا ذخیرہ تھا، کسی مین فوجی افسرون کی رہائش گاہ تھی، مقبرہ ابو الحسن مین رنجیت سنگھ کے فرنگی جرنیل[۵۱] ایوی ٹیبل (General Avitabile) کی ماتحت فوجون کا ذخیرۂ بارود رہتا تھا، اور بجوپ سنگھ کیدان اس کا مہتمم تھا،

زمانہ کی نیرنگیان دیکھئے، کہ جس پاکیزہ عمارت مین تقریباً سوا سو سال تک خوش الحان قاری شب و روز قرآن پاک کی تلاوت کرتے رہے، اس مین بارود بھر دی گئی، زمانہ نے اسی پر اکتفا نہ کی، بلکہ شیر سنگھ کے عہد حکومت مین بجلی گری، اس سے بارود کے ذخیرہ مین آگ لگ گئی، دھماکے کی آواز دور دور تک سنائی دی، بہت سے محافظ جل مرے، مقبرے کی عمارت کو از حد نقصان پہنچا، اس کا بہت سا حصہ جل گیا، اور دیوارین بارود کے پھٹنے سے اڑ گئین،

قفس مین مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیان کیون ہو

مگر مغلیہ عمارتون کی سخت جانی اور استحکام ملاحظہ ہو کہ سوختہ محرابون پر سیاہ رنگ کا جھلسا ہوا گنبد پھر بھی قائم رہا، اگر یہی بچا رہتا، تو بھی غنیمت ہوتا کہ اسلامی آثار کے فریفتہ اسی کو دیکھ کر عہد رفتہ کی یاد تازہ کر لیتے، لیکن زمانہ نے اس نقش کو بھی نہ چھوڑا، ۱۸۴۹ء مین پنجاب مین انگریزی حکومت کا آغاز ہوا، یہ وہ دور ہے، جس مین محققین آثار عتیقہ اور علمائے تاریخ نے قدیم ٹیلون کو کھود کر، جنگلون اور ویرانون کی خاک چھان کر، پتھرون، شکستہ برتنون، اور سنگ ریزون کی زبانی عہد عتیق کی تاریخ مرتب کی ہے، لیکن شومئی بخت دیکھئے، کہ اسی عہد مین لاہور کی اکثر قدیم اسلامی یادگارین تباہ و برباد ہوئین، یا کارکنان محکمۂ آثار قدیمہ کی تغافل شعاری کا شکار ہو کر کس مپرسی کی حالت مین بہت جلد مٹنے کو ہین،

جدا ہے مقسوم اپنا اپنا الگ ہے تقدیر اپنی اپنی
دیا ہے اس شوخ دلستان نے کسی کو بوسہ کسی کو گالی

بہر کیف ۱۸۶۳ء تک مقبرے کی عمارت موجود تھی، تحقیقات چشتی مین اس کے حالات مرقوم ہین، مگر ۱۸۸۲ء کی شائع شدہ تاریخ لاہور مؤلفہ رائے بہادر کنھیا لال سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس وقت اس مقبرے کا نشان صفحۂ ہستی سے مٹ چکا تھا، اور صرف محترمہ مخدومہ بیگم صاحبہ کا مقبرہ اور کنوان باقی رہ گئے تھے، مقابر کی فصیل اور تحفہ محلات کے کھنڈرات

۵۱ رنجیت سنگھ کی ملازمت مین بہت سے افرنگی الاصل جرنیل تھے، جن مین سے اکثر نپولین شاہ فرانس کے قدیم ملازم تھے، اور اس کی وفات کے بعد تلاش روزگار مین ادھر آ گئے تھے، ان مین ونتورا، الارڈ، کورٹ اور ایوی ٹیبل وغیرہ مشہور ہین، ان کی مدد سے رنجیت سنگھ نے اپنی فوجی قوت کو پنجاب کی جنگجو اقوام پر مسلط کرنے کے لئے ایک زبردست لشکر تیار کیا تھا، جب ایوی ٹیبل پشاور کا فوجی گورنر ہوا، تو اس نے غیور پٹھانون کو غلامی پر رضامند کرنے کے لئے ان پر بڑے ستم ڈھائے، روزانہ بیسیون پٹھانون کو پھانسی دینا اس کا معمول تھا، عوام اس کا نام بگاڑ کر اسے طوبیلہ صاحب کہا کرتے تھے ۵۲ اٹھارہوین صدی عیسوی کے دوسرے نصف مین جب پیہم بیرونی حملون سے مسلمانان پنجاب کا شیرازہ بکھر گیا، تو سکھون نے موقع پا کر پنجاب کے شہرون کو تاخت و تاراج کرنا شروع کر دیا، اسی دور مین لاہور بھی جو کہ ایک وسیع اور خوبصورت شہر تھا، لٹ گیا، ۱۷۹۹ء مین جب رنجیت سنگھ نے اس شہر پر قبضہ کیا، تو تمام شہر بے چراغ تھا، اور میلون تک کھنڈرات پھیلے ہوئے تھے، اس نے قدیم اکبری شہر کے گرد خندق اور ڈبل فصیل بنوا کر اسے آباد کیا، اور بیرون شہر کے کھنڈرات کی اینٹین نئی عمارات مین استعمال کی جانے لگین، کھنڈرات کے علاوہ اینٹ پتھر کے لالچ نے بہت سی دیدہ زیب یادگارین بھی صفحۂ ہستی سے محو کر دین، انگریزی عہد مین بھی کئی سال تک یہ اینٹین بکتی رہین، اکثر عمارات کی بنیادین کھودتے کھودتے گہرے گڑھے

کی اینٹین بک چکی تھین، اور باغ نذرِ خزان ہوگیا تھا، ۱۸۸۲ء کے بعد مخدومہ بیگم کا مقبرہ بھی نیلام ہو کر گرا دیا گیا،

ترے کمال ستم کی یہ یادگار رہے

نہ ہم رہین نہ ہمارا کہیں مزار رہے

سید محمد لطیف کی کتاب "لاہور" مطبوعہ ۱۸۹۲ء سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس فلک نشان عمارت کی یادگار صرف اسکا بڑا کنوان باقی رہ گیا تھا، باغ مقابر اور حویلیون نے لق و دق میدان کی صورت اختیار کر لی تھی، مگر آج اس کنوین کا نشان بھی ڈھونڈے نہین ملتا، جس جگہ یہ مقابر تھے، وہان اب ریلوے جنرل سٹورز اور کارخانے تعمیر ہو چکے ہین،

محلہ مغل پورہ کی شوکت رفتہ کی یادگار اب صرف علی مردان خان کا فلک بوس مقبرہ، مدرسہ ابو الحسن تربتی کے مذکورہ بالا صحن اعلیٰ حضرت حامد قاری کا مزار اور نصرت خان کا مقبرہ باقی رہ گئے، اول الذکر دونون یادگارین ریلوے سٹور کے اندر ہین، انھین بلند دیوارون مین محصور کر کے ایک چھوٹا سا راستہ بنا دیا گیا ہے، اور ہر شخص ان کی زیارت کر سکتا ہے، مقبرہ نصرت خان ریلوے کیرج شاپ کے اندر ہے، اس کی ملحقہ مسجد اور دیگر مکانات گرائے جا چکے ہین، اور وہان تک جانے کے لئے کوئی راستہ نہین، ان کارخانون کے پاس ہی لاہور سے امرتسر کی جانب جانے والی ریلوے لائن کا پہلا اسٹیشن واقع ہے، جس کا نام قدیم مغلیہ محلے کے نام پر مغل پورہ رکھا گیا ہے،

ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت

رفت منزل بدیگرے پرداخت

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳) بن گئے تھے، مگر اینٹین ختم نہ ہوتی تھین، آخر انگریزون نے شہر مین ان گڑھون کا وجود حفظ صحت و جان کے لئے خطرہ قرار دے کر انھین بند کرا دیا، اور اینٹون کا نکالنا حکماً روک دیا، انگریزی عہد کے آغاز مین جو مایۂ ناز یادگارین سرکاری محکمۂ نزول یا بعض افراد کی مہربانی سے برباد ہوئین، ان مین ان مقابر کے علاوہ جامع مسجد جہانگیر (عیدگاہ) مقبرہ قاسم خان، دروازہ نخاس مسجد دارا شکوہ، مسجد شاہ بدر، مسجد سرائے گویان والی، مسجد خواجہ نور اللہ وغیرہ قابل ذکر ہین، ۱۸۶۵ء یہ مقابر کے بعد دیگرے بعض دیگر یادگارون کی طرح حکومت پنجاب کے محکمۂ نزول نے نیلام کرا دیے، اور خریدنے والے ٹھیکہ دارون نے انھین گرا کر اینٹین فروخت کر دین،

## خط و کتابت کے لئے

ضروری اطلاع

معارف کے مضامین اور علمی استفسارات اور ان کے متعلق جملہ خط و کتابت شخصی نام کے بجائے صرف اڈیٹر معارف کے پتہ سے، اور معارف اور دار المصنفین کے انتظامات اور فرمایشات کے متعلق منیجر صاحب دار المصنفین کے نام سے کی جائے، ان تمام امور کے متعلق میرے نام خط لکھنے سے تعمیل مین دقت ہوتی ہے، امید ہے کہ احباب مجھے زحمت سے بچانے کے لئے اس کا خاص طور سے خیال فرمائیں گے

سید سلیمان ندوی



# اردو کی دو قدیم کتابین

اور

# ان کا زمانۂ تصنیف

از

جناب محمد خلیل صاحب تجاروی بی ایس سی علیگ

رسالہ معارف بابت ماہ مارچ ۱۹۴۲ء مین جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی نے دیوانِ منعم کے متعلق چند شبہات ظاہر فرمائے ہین، وہ تحریر اب میرے مطالعہ مین آئی ہو جوابًا اس کے متعلق اپنے معلومات پیش کرنے کا خیال ہوا،

(۱) تاریخ ادب اردو مطبوعہ نولکشور پریس جو اس وقت پیش نظر ہے اس مین صفحہ ۳۰ پر سلطان محمد قلی قطب شاہ ولد ابراہیم قطب شاہ کا سنہ وفات ۱۶۱۱ء لکھا ہے، اور سلطان محمد قطب شاہ کا سنہ وفات صفحہ ۶۰ پر ۱۶۲۵ء ہے، لیکن ہاشمی صاحب نے اسی کتاب کے حوالہ سے سلطان محمد قلی قطب شاہ کا سنہ وفات ۱۶۲۵ء تحریر فرمایا ہو، اسی طرح ہاشمی صاحب کو کتاب سب رس کے بارے مین بھی شاید سہو ہو گیا، ورنہ تاریخ ادب کے صفحہ ۶۰ پر سب رس کا سنہ تصنیف ۱۰۳۰ھ تا ۱۰۳۵ھ تحریر ہے، اور محمد قلی قطب شاہ کی وفات کا سنہ ہجری ہاشمی صاحب نے ۱۰۲۰ھ لکھا ہے، بہارستان مین ۱۰۲۲ھ ہی،

(۲) مثنوی واقعات امامیہ کے تصنیف رسولی ہونے کا ثبوت طلب کیا ہے تو واضح ہو کہ مثنوی مین مصنف کا نام وطن بادشاہ وقت ہمایون بادشاہ کا نام اور اسکی تعریف موجود ہے، جس سے زمانہ کا تعین ہوتا ہے، اور ایک جگہ سنہ تحریر ہے، پھر کتاب مراۃ الانساب، مراۃ احمدی، نسب نامہ مفتیان ریواڑی ارمغان دلی وغیرہ سے مصنف اور اس کے آباء و اجداد کے حالات علم مین آتے ہین جس مین ان کا شجرۂ نسبی و شجرۂ قرآنی و شجرۂ شاعری وغیرہ بھی درج ہین، اور اس کے بعد کا سلسلۂ شاگردی قاری حافظ حکیم سید شاہ نجم الدین صاحب نصیری کوثری کے شاگرد تک پہنچا ہے،

حضرت شاہ غلام رسول کے مزار شریف کے متصل قلندری مسجد کی دیوار پر (جس کو قنائی مسجد بھی کہتے ہین) اس کا قطعۂ تاریخ چونے کے ابھرے ہوئے حرفون مین لکھا ہی، دیوار گر جانے سے کچھ عبارت کے حروف ٹوٹ گئے ہین، بقیہ یہ ہین ؎

زگلزار نظام الدین گلے رفت ۔۔۔ رسولش نام می گویند باغم

سیہ دل ماند لالہ از رحیلش ۔۔۔ ......فخر دین ازکشت داغم

(۳) دیوان منعم کی بابتہ لکھتے ہین، کہ اس کو ۹۴۴ھ ۱۵۳۷ء یا اس زمانہ کا دیوان قرار دینے کی کوئی وجہ نہین معلوم ہوتی، ہو سکتا ہے کہ محمد اشرف منعم تخلص رکھتے ہون، مگر کسی اور شخص کا تخلص منعم ہونا خارج از قیاس نہین ہو سکتا، الخ

اس سلسلہ مین عرض ہو کہ حضرت مولانا شاہ محمد اشرف، حضرت شاہ غلام رسول (قدس اللہ اسرارہما) کے برادر زادہ ہین، (کتب مسطورہ بالا) اور حضرت سجادہ نشین صاحب خانقاہ شعیبیہ تجارہ آفتاب میوات کے بزرگان گذشتہ سے ہین، یہان کے سوا اور کہین یہ دیوان موجود نہین، مولانا عبد الحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند بھی اپنے گرامی نامہ نمبر ۵۳۴۹ مین ارقام

فرماتے ہین کہ

"میرے کتب خانہ مین قدیم اردو کے کئی سو قلمی نسخے موجود ہین، مگر آپ کے حضرت شاہ غلام رسول اور دیوان منعم کا کلام نہین ملا، آپ کی بدولت اس کی اطلاع بھی مل گئی، کیا یہ ممکن ہے کہ مین آپ کی وساطت سے اس کی زیارت کر سکون، مثنوی مین ہمایون بادشاہ کا نام اور اس کی مدح موجود ہے، جو کافی ثبوت اس امر کا ہے کہ اس وقت کی لکھی ہوئی ہے، مین آپ سے مل کر اس مثنوی اور دیوان منعم کے متعلق گفتگو کرنا چاہتا تھا، یا یہ ممکن نہ ہو تو پھر دوسری صورت یہ ہے کہ اُن کی نقلین مل جائین"

رہا بعض شعرون کا کچھ صاف ہونا تو ہو سکتا ہے، مضمون نگار نے صاف اشعار خاص طور پر منتخب کر کے اس لئے لکھے ہون کہ جس طرح کلام ولی و مثنوی میر حسن مین جو ڈیڑھ سو سال پیشتر کی زبان مین ہے، بہت سے اشعار کس قدر صاف ہین، ولی کے بعض اشعار بالکل آج کل کے معلوم ہوتے ہین، جیسے:-

خوبرو خوب کام کرتے ہین    اک نگہ میں غلام کرتے ہین

آرزوے چشمۂ کوثر نہین    ہون پیاسا شربت دیدار کا

اے ولی رہنے کو دنیا میں مقام عاشق    کوچۂ یار ہے یا گوشۂ تنہائی ہے

مثنوی میر حسن کے متعلق مولانا آزاد حیرت سے پوچھتے ہین، "کیا اسے سو برس آگے والون کی باتین سنائی دیتی تھین، کہ جو کچھ کہا صاف وہی محاورہ اور وہی گفتگو ہے، جواب ہم تم بول رہے ہین" اور دیکھیے کتاب "دکن مین اردو" کے اندر خواجہ گیسو دراز قدس سرہٗ متوفی ۸۲۵ھ کا یہ شعر موجود ہے،

پانی مین نمک ڈال مزا دیکھنا اسے    جب گھل گیا نمک تو نمک بولنا کسے (از بیاض نظر)

اس کے ساتھ کلام منعم پڑھا جائے :-

منعم جو نشہ سبز میں سرخوش ہین ان کے تئین    می سیتی زیادہ بخشے ہین دیکھو بہار خط

تو نمک والے شعر سے کہین زیادہ قدامت کلام منعم مین پائی جاتی ہے،

اسی طرح سلطان محمد قلی قطب شاہ متوفی ۱۰۲۲ھ یا ۱۰۲۰ھ کا یہ شعر ہے :-

کرتے ہین دعوی شعر کا سب پنی طبع سون    بخشا فصیح شعر معانی کے تئیں خدا

اور سلطان محمد قطب شاہ متوفی ۱۰۳۵ھ کا یہ شعر لکھا ہے،

ساقیا آ شراب ناب کہان    چندر کی پیالی مین آفتاب کہان

سلطان عبد اللہ قطب شاہ متوفی [illegible] کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو ؎

آب حیات سے ہے زیادہ یہ لب ترا    کرتے ہین مجھ سے خضر علیہ السلام بحث

اس کے مقابلہ مین کلام منعم دیکھیے :-

منعم جو نشہ سبز مین سرخوش ہین ان کے تئین    می سیتی زیادہ بخشے ہے، دیکھو بہار خط

جس سے اشعار مذکورہ بالا سے کہین زیادہ قدیم زمانہ کا اندازہ ہوتا ہے،

---



# ادبیات

## کلام احسان

از جناب مرزا احسان احمد صاحب بی اے، ال ال بی، علیگ، اعظم گڈھ

عبث ہوش و خرد کا ادعا معلوم ہوتا ہے    جنون ہی زندگی کا رہنما معلوم ہوتا ہے

یہ کیا اب سکون جانفزا معلوم ہوتا ہے    مگر دل وقف تسلیم و رضا معلوم ہوتا ہے

کوئی شوریدہ سر محو دعا معلوم ہوتا ہے    کہ جنبش مین حریم کبریا معلوم ہوتا ہے

نظر سے گرچہ وہ میری جدا معلوم ہوتا ہے    مگر پھر بھی عجب اک ربط سا معلوم ہوتا ہے

یہ ریزش اشک پیہم کی یہ سوزش جان پرغم کی    تمہاری یاد مین سب کچھ بھلا معلوم ہوتا ہے

زبان آمادۂ شکوہ سرائی ہو تو کیونکر ہو    کہ مجھ کو حسن بالکل بے خطا معلوم ہوتا ہے

کسی محمل نشین کی جنبش ابرو سے کیا ہوتا    غبار قیس خود اٹھتا ہوا معلوم ہوتا ہے

کرون کیا درد کو مرہون منت چارہ سازون کا    کہ اب اپنا یہ خود مشکل کشا معلوم ہوتا ہے

نظر آتی کسی کو ہو گی ذوق عشق کی منزل    مجھے تو اک غم لا انتہا معلوم ہوتا ہے

یہ ساز زیر گو خاموش ہے لیکن پس پردہ    عجب اک مضطرب آتش نوا معلوم ہوتا ہے

عجب ذرہ ہے یہ دل بھی کہ جس کے قبض سے جنبان    یہ سارا عرصۂ ارض و سما معلوم ہوتا ہے

غبار زندگی ہے خود ترا اک پردۂ حائل    دگر نہ اس کا جلوہ برملا معلوم ہوتا ہے

بچاتا پھر رہا ہے یون جو کشتی موج طوفان سے    عجب بے راہ رو یہ ناخدا معلوم ہوتا ہے

چلا ہے ساتھ شاید لیکے عقل مصلحت بین کو    یہ دل کیون ٹھوکرین کھاتا ہوا معلوم ہوتا ہے

یہ کیسی ہو رہی ہے آج جنبش چشم ساقی کو    کہ اک خمخانۂ اسرار وا معلوم ہوتا ہے

یہ ہے کس کے تصور کی تجلی سامنے جس کے    مجھے سب محو نقش ما سوا معلوم ہوتا ہے

اشارہ اس نظر کا دیکھتا ہون وجد کرتا ہون    عجب اک نغمہ بے ساز و صدا معلوم ہوتا ہے

نظر حیران، زبان خاموش، دل مجبور، جان عاجز    بس اب تو کچھ ترا ہی آسرا معلوم ہوتا ہے

جنون کیسے کہوں تیرے جنون کو مین کہ تو اب تک    غم سود و زیان مین مبتلا معلوم ہوتا ہے

جہان تک ان کے انداز ستم پر غور کرتا ہون    سراپا عالم مہر و وفا معلوم ہوتا ہے

کہان جائین کسے دیکھیں کہ ہم شوریدہ جانون کو    ترے ہی در پہ ہو جانا قضا معلوم ہوتا ہے

نظر کیا پردہ ہاے ساز کی جنبش پہ ہے تیری    یہ سب کیف دل رنگین ادا معلوم ہوتا ہے

یہ کیون آزردہ دل بیٹھے ہین ارباب چمن آخر    خزاں کا رنگ بھی کچھ دل ربا معلوم ہوتا ہے

او ائین تو ذرا احسان کی اہل نظر دیکھین    بظاہر گو فقیر بے نوا معلوم ہوتا ہے

# باب التقریظ والانتقاد

## "مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر"

مرتبہ مولانا مسعود عالم صاحب ندوی، حجم ۱۹۰ صفحے، تقطیع چھوٹی، ناشر مکتبہ دین و دانش، کھنیان کنوان، بانکی پور، پٹنہ، قیمت ۱۲؍

از

سید ریاست علی ندوی

مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے افکار و خیالات پر چند مستقل کتابیں شائع ہوئی ہیں، زیر نظر رسالہ ان کے جواب و نقد میں ترتیب پایا ہے، مولانائے مرحوم اپنی پوری زندگی میں پرشور انقلابی حوادث سے دوچار ہوتے رہے، اور ان کی زندگی کے ہر نئے موڑ پر نیا ماحول اور نئے افکار اُن کے سامنے آتے گئے، دیوبند کی دینی و مذہبی فضا سے نکل کر لادینیت کے مرکز ماسکو میں پہنچا پھر ترکی میں میں اُسی زمانہ میں جا جب کہ تجدد پسند ترک پوری ترکی قوم کی قلب ماہیت میں مصروف تھے، پھر اچانک حجاز میں چلا آنا جہاں نجد کی دینی تحریک کو نیا غلبہ حاصل ہوا تھا، ان کے افکار میں تزلزل پیدا کرنے کے لئے کچھ کم موثرات نہ تھے، ان سب ملکوں میں دینی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی افکار و خیالات میں شکست و ریخت کا عمل غیر معمولی سرگرمی سے جاری تھا، مولانائے مرحوم نے ان متضاد ماحولوں میں اپنی غیر معمولی فطری ذہانت پر اعتماد رکھ کر ان متضاد افکار و خیالات کو تولنے اور انھیں رد و قبول کرنے کا عمل جاری رکھا، اور اپنی فطری ذہانت سے متضاد افکار نظریوں اور رایوں کو ہم آہنگ کرنے اور اپنے فہم کے مطابق ان میں باہم رابطہ قائم کرنے میں اپنی ذہانت کا حیرت انگیز کمال دکھایا،

اتفاق کی بات ان کے خیالات کی ترجمانی کے لئے جو ذی علم نوجوان پروفیسر محمد سرور (جامعی) نامزد کیے گئے، انھیں بھی چھوٹے پیمانہ پر تقریباً اسی قسم کے متضاد ماحول سے سابقہ رہ چکا تھا، ایک طرف وہ جامعہ ملیہ سے وابستہ تھے، دوسری طرف وہ اسی چہار دیواری میں مولانا سورتی مرحوم کے ارشد تلامذہ میں سے تھے جنھیں بقول موصوف "اسلاف کے تتبع میں بڑا تشدد تھا، اور طالب علم کے لئے شریعت کی معمولی سے معمولی شعار کی بھی عدم پابندی کو گوارا نہ کر سکتے تھے" پھر وہ مصر پہنچے، اور ایک طرف وہ جامعہ ازہر کے شیوخ کے حلقہ درس میں بیٹھے، اور دوسری طرف مشہور مصری بے دین ملحد، ڈاکٹر طہٰ حسین کے لکچروں میں شریک رہے، اور جب وہ مصر سے لوٹے تو بقول خود "ایک مسلسل ذہنی کوفت ہر لمحہ اضطراب کی کیفیت، نہ کامل یقین، اور نہ پورا انکار، تشکک جو ہر وقت دماغ کو معروف اور دل کو پریشان رکھے، ...... یہ حاصل تھا، جو وادی نیل سے لیکر راقم الحروف وطن لوٹا" (مقدمہ مولانا عبید اللہ سندھی ص ۱۴) در اصل یہ موزون ترین ذہنی آئینہ ہو سکتا تھا جس میں مولانا سندھی کے متضاد افکار و خیالات کی عکاسی کا کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام پا سکتا تھا، اور یہ حقیقت ہے کہ ترجمان نے بڑی دلکشی و خوش سلیقگی سے اپنا فرض انجام دیا، متضاد افکار و خیالات کو ایک سلسلہ میں پرونے انھیں تشبیہات و تمثیلات سے سنوارنے، کسی ایک ہی واقعہ کو دو متضاد زاویوں سے دیکھنے، اور دونوں کو بظاہر دلنشیں انداز میں سمجھا دینے کی ایسی کم مثالیں ملیں گی، لیکن حق و باطل کو



خواہ جتنے پردوں میں چھپایا جائے جس قسم کا آب و رنگ دیا جائے، اور ذہانت کی مدد سے جیسے نتائج مرتب کئے جائیں، اہل نظر پر ان کی حقیقتیں آشکارا رہیں گی، مگر اسلام اور مسلمانوں کی مذہبی، تمدنی اور ملی زندگی کے لئے ایسی کتابیں زیادہ نقصان رساں نہیں، جو کھلے طور پر الگ شاہراہ اختیار کرکے تیار کی گئی ہوں، لیکن ایسی کتابوں سے جیسی کہ مولانا سندھی کے سلسلہ میں شائع ہوئی ہیں، خصوصاً نوجوان اور دین اور اسلامی تاریخ و تمدن سے ناواقف مسلمان طبقوں میں جس قسم کے زہریلے اثرات کے پھیلنے کا امکان ہو سکتا ہے، اس کا حقیقی اندازہ لگانا بھی دشوار ہے،

مولانا سندھی نے جب ابتداءً اپنے خیالات ظاہر کئے، تو ان کے دیرینہ عقیدت مند حلقوں میں ان کے مفہوم و معانی پر شک و شبہہ کی نظر ڈالی گئی، الفرقان کے ولی اللہ نمبر میں مدیر الفرقان نے ان کی عبارتوں کے مختلف مفہوموں کے اعتبار سے ایسے پہلوؤں کو اختیار کرنا چاہا، جو مسلمہ حقائق کے مخالف نہ ہوں، اور دبی زبان سے ان کے مخالف پہلوؤں کے مطالب سے اختلاف کرکے ان کی تردید کی، لیکن مولانا سندھی اپنے افکار کی اشاعت کے لئے ایک مستقل مجلس کی تاسیس عمل میں لا چکے تھے، چنانچہ وہ مستقل تصنیفات کی شکل میں بڑی آب و تاب سے شائع کئے گئے، اور ملک کے سنجیدہ حلقوں میں ان کی مستقل تردید کی ضرورت محسوس کی گئی، چنانچہ اس سلسلہ میں سب سے پہلے مولانا مسعود عالم صاحب ندوی نے معارف میں ان کی دو کتابوں پر اپنا سلسلہ مقالات شائع کرایا، اب ان مضامین کا مجموعہ عام افادہ کے لئے عنوان بالا سے رسالہ کی شکل میں شائع کیا گیا ہے، موصوف کا پہلا سلسلہ مضامین مولانا سندھی کی زندگی میں شائع ہوا تھا، چنانچہ مولانائے مرحوم اور ناقد کے درمیان بعض خیالات کی تشریح و توضیح میں مراسلت بھی ہوئی، خطوط بھی رسالہ میں منسلک کر دیئے گئے ہیں، جن سے رسالہ کی افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے، نیز رسالہ کی ابتداء میں حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کا ایک مختصر و جامع مقدمہ ثبت ہے، جس میں ہندوستان میں مسلمانوں کے دور تنزل اور اس کے دور کرنے کے لئے مختلف مصلحین و مفکرین کی مساعی کا ذکر آیا ہے، اور اُن کے نتائج اختصار سے پیش کئے گئے ہیں، پھر مولانا سندھی کے سوانح حیات کے پس منظر سے ان کے افکار کا جائزہ لیا گیا ہے، اور ان کی بعض غلطیاں نمایاں طور پر دکھائی گئی ہیں، افسوس ہے کہ اس سلسلہ میں صفحہ ۵ پر مولانائے موحوم کے افکار کے تذکرہ میں اُن کے ماخذ کا حوالہ شائع ہونے سے رہ گیا ہے، انشاء اللہ معارف کے کسی آیندہ نمبر میں یہ مقدمہ مع حوالوں کے نقل کر لیا جائے گا،

مولانا مسعود عالم کا پہلا سلسلہ مضمون مولانا سندھی کی تصنیف "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" پر استدراک و تنقیح کے عنوان سے ہے، مولانا سندھی نے اس تصنیف میں حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادہ کو ایک منظم سیاسی تحریک چلانے والے کی حیثیت سے پیش کیا ہے، ناقد نے اس پر فاضلانہ نقد کیا ہے، اور اس سلسلہ میں مولانائے مرحوم نے مرکزیت ثابت کرنے کے لئے واقعات کو جس رنگ میں پیش کیا ہے، اس کی اصل حقیقت ظاہر کی ہے، مولانا نے "پارٹی" کی اس تشکیل میں حضرت مولانا سید احمد شہید اور حضرت مولانا اسمٰعیل شہید رحمہما اللہ کے ان مجاہدانہ خدمات کو جو ان کے ہاتھوں انجام پائے، اور جس کا غلغلہ ایک زمانہ میں پورے ہندوستان میں بلند ہوا، گویا ایک ضمنی حیثیت دے دی ہے، پھر اس تحریک کے بڑے بڑے اکابر جو مختلف صوبوں میں گذرے، ان کا تذکرہ بھی ایسے اسلوب میں کیا ہے، جو حقیقت سے دور تھا، ناقد نے تاریخی حقائق و شواہد سے ان بزرگوں کا اصل مقام دکھایا ہے، نیز چونکہ اس تحریک کے اکابر اپنے عقائد کے لحاظ سے مولانا سندھی کے بقول اسلام کی حجازی تعبیر کے بجائے عجمی یا "ایرانی بائی لاز" کے پیرو نہ تھے، اس لئے مختلف موقعوں پر ان کے ساتھ انصاف قائم نہ رہ سکا ہے، ناقد نے اپنی بحث و نظر میں ان مسائل کو بھی صاف کیا ہے، نیز بعض دوسری تحقیقی بحثیں بھی آئی ہیں،

دوسرا مقالہ "مولانا عبید اللہ سندھی" نام تصنیف پر لکھا گیا ہے، اس کتاب میں مولانا کے مختلف نوعیتوں کے افکار پیش کئے گئے ہیں جن کا تعلق عقائد، کلام، تصوف، فقہ، تاریخ و سیاست سب ہی سے ہے، اس کے ساتھ مولانا کے چند خاص مذہبی سیاسی افکار و خیالات ہیں، اس سلسلہ میں مولانا نے ایک طرف پوری اسلامی تاریخ اور دوسری طرف ہندوستان کے پورے اسلامی عہد حکومت کا اپنے نقطۂ نظر سے جائزہ لیا ہے، اور عجیب و غریب تضاد کے ساتھ اپنے نظریے بیان کئے ہیں، ناقد نے اسلامی علوم و عقائد کے مباحث پر جامعیت سے نقد کیا ہے، اور اسلام کے صحیح نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے، اور تاریخی مباحث میں اجمالی تبصرہ کر دیا ہے، اور واضح اغلاط کو نمایاں کیا ہے،

مولانا کے افکار کا جائزہ لینے کے لئے مستقل تصانیف کی ضرورت ہے، وہ ایک ہی سانس میں متضاد باتیں کہہ جانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، ایک ہی بات کو جداگانہ زاویۂ نگاہ سے پیش کرتے ہیں، اور ایک دوسرے کو متضاد نتائج نکالتے ہیں، مثلاً ایک طرف تو وہ اسلام کو "انٹرنیشنل مذہب" کی صورت میں پیش کرتے ہیں دوسری طرف "فی کل ارض آدم مثل آدمکم و نوح مثل نوحکم" ایک حدیث کا حوالہ دیکر کہتے ہیں:-

"یہاں ارض سے مراد قوم ہے اور دنیا کو سات بڑی بڑی قوموں، تہذیبوں یا عالموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، تورات انجیل اور قرآن صرف اس طرح کی ایک قوم کی تاریخ ہے، اسی قسم کے واقعات تقریباً سب قوموں میں گذرے ہیں" (مولانا عبید اللہ سندھی ص [illegible])

اس طرح قرآن مجید صرف ایک قوم یعنی عرب کی تاریخ بن گیا،

پھر فرماتے ہیں:-

"مخاطبین کی رعایت سے اسے ایک خاص زبان اور مکان سے مخصوص کرنا ہوتا ہے، قرآن کے پیرایۂ بیان کی محدودیت بھی اسی بنا پر ہے" (ص ۸۶)

اس کے بعد عالمگیریت اور جامعیت کے تصور کو لاتے ہیں، مگر محض "بین السطور مفہوم" کے اعتبار سے، چنانچہ فرماتے ہیں:

"لیکن اس کے باوجود جا بجا بین السطور مفہوم کی عالمگیریت اور جامعیت نمایاں ہے، اگر آدمی قرآن کے مطالعہ میں تدبر و تعمق سے کام لے تو اس پر واضح ہو جائے گا، کہ کل نوع انسانی قرآن میں اپنا مافی الضمیر و مقصد پا سکتی ہے" (ص ۸۶، ۸۷)

گویا اس کا "کافۃ للناس" ہونا، یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رحمۃ للعالمین ہونا وغیرہ سب کے سب قرآن مجید کے بین السطور مفاہیم ہیں، اور اس کے اصل مخاطب محض عرب ہیں، باایں ہمہ وہ انٹرنیشنل مذہب ہے،

اسی طرح مولانا کے نزدیک حقیقی مومن و کافر کی وہ نشانیاں نہیں، جو قرآن مجید نے اپنی واضح آیات میں پیش کی ہیں، بلکہ "انانیت کا بیدار نہ ہونا مولانا کے نزدیک کفر ہے، اور جس کی انانیت بیدار ہو جائے، گو رسمی طور پر اسے لوگ کافر کہتے ہوں، وہ حقیقت میں مسلمان ہوتا ہے" (صفحہ ۱۰۱)

گویا خواہ کوئی توحید ذات و صفات کا قائل ہو یا نہ ہو، رسالتِ محمدی کا خواہ کوئی اقرار کرے یا انکار، یا بدرجۂ اعلیٰ سکوت اختیار کرے، لیکن اس کی انانیت بیدار ہو چکی ہے، تو وہ مسلمان ہے، اور عند اللہ بری الذمہ، ظاہر ہے، کہ ان عقائد کو اسلام سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟

مولانا کے نزدیک اسلامی تصوف پر سب سے زیادہ اثر ہندو ویدانتی فکر کا ہوا ہے" (ص ۱۳۱) حالانکہ اسلامی تصوف کا



تمام تر دار و مدار خالصۃً کتاب و سنت پر ہے، تصوف وہی ہے جس کو شریعت کی اصطلاح میں احسان سے تعبیر کیا گیا ہے، اور جس کو مولانا جذبۂ تصوف سے موسوم کرتے ہیں (ص ۱۳۰) البتہ یکسوئی کے حاصل کرنے کے لئے ذریعہ و آلہ کے طور پر بعض طریق عمل [illegible] سے اختیار کئے گئے ہیں، لیکن ان کی حیثیت ویسی ہی ہے، جیسے کہ بعض بزرگوں کی تمثیل کے مطابق نماز کے اوقات کے انضباط کے لئے گھڑی سے مدد لی جاتی ہے، اس طریق عمل کو عقائد و روحانیات سے تو کوئی علاقہ نہیں ہے،

مولانائے مرحوم کا خیال ہے کہ ایران و ہندوستان کے مسلمانوں میں "آریائی ذہنیت" ہمیشہ باقی رہی، عقیدہ کی تبدیلی سے فرد یا جماعت کی ذہنیت نہیں بدلا کرتی، ایرانی و ہندوستانی مسلمان ہوئے تو انھوں نے پیروں اور پیغمبروں کو وہ درجہ دیدیا، جو قبل از اسلام اپنے بزرگوں کو دیتے تھے، اور پیر کا حکم خدا کا حکم سمجھا جاتا تھا" (صفحہ ۱۵۰)

اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے متعلق ارشاد ہے کہ "انھوں نے تجلی کا مسئلہ حل کر کے ایک طرف تو ایرانی (فلسفی حکمت) اور سامی نبوت میں اس اختلاف کو رفع کر دیا، اور دوسری طرف غیر مسلموں پر اسلام کی حقانیت ثابت کر دیا" (صفحہ ۱۵۹)

ان مسائل میں جن کا تعلق خالصۃً کتاب و سنت اور نفس اسلام سے ہے، ان میں آریائی ذہنیت کا سراغ لگانا اور ان بزرگوں پر وطنیت کے جذبہ و اثر سے آریائی ذہنیت کو قبول کرنے کا الزام لگانا کیسی صریح ناانصافی ہے، اگر اس موقع پر اسلام میں اتباعِ رسالت کی جو تشریح کی گئی ہے، اور تصوف میں شیخ کا جن اوصاف سے متصف ہونا، اور اس کے اتباع میں جن جن قیود و حدود کے قائم رکھنے کی تلقین کی گئی ہے، مولانا انھیں اپنی نگاہ میں رکھتے، تو وہ اس قسم کے نظریے قائم نہ کر سکتے تھے،

مولانا فرماتے ہیں:-

"نبوت انسان کی جبلی استعداد کا انکار نہیں کرتی، اور انسان کی جبلی استعداد اس کے خاص ماحول سے ہی بنتی ہے، مثلاً ہندوستان میں فطرۃً ذبح حیوانات پسندیدہ نہیں، اس لئے اگر کوئی ہندوستانی ذبح حیوانات سے بچے، تو اس کا یہ فعل خلافِ نبوت نہ ہوگا، کیونکہ انسانوں کی جو فطرت ہوتی ہے نبوت اس کے خلاف نہیں جاتی، نبوت کا کام یہ ہے، کہ وہ افراد کے فطری رجحانات اور ان کی جبلی استعدادوں کے مطابق ان کے لئے ترقی کی راہیں بتائے" (ص ۵۵-۲)

یہاں اولاً یہ سوال ہو سکتا ہے، کہ یہ کلیۃً صحیح کیونکر ہے، کہ ہندوستان میں قدرۃً "ذبح حیوانات پسندیدہ نہیں" اگر ایسا ہوتا، تو قربانی کے جو احکام ویدوں میں آئے ہیں، وہ کیوں پائے جاتے، یا آج بھی ہندوؤں (جینی، بودھ نہیں) میں عام طور پر قربانی کی رسمیں کیوں انجام پاتی ہیں، ان میں رسوم قربانی کے ترک کرنے کی تلقین تو صرف پارس ناتھ، مہابیر اور بودھ نے کی ہے، لیکن نرگنتھ، جین اور بودھ مت کے ماننے والوں کی کتنی تعداد ہندوستان میں پائی جاتی ہے، بودھ مت کے فروغ کے بعد جب برہمنوں کے دورِ حکومت میں اس کے خلاف تلقین کی گئی، تو ہندوستان کی فطرت و جبلت کے مخالف ہونے کے باوجود قربانی کی رسموں کو دوبارہ کیوں فروغ حاصل ہوا،

اگرچہ یہ صحیح ہے کہ ویدک دھرم کے کچھ پیروؤں نے جین اور بدھ مت کے ایک اصول "اہنسا" کو اپنے دھرم میں وسعت دے کر قبول کر لیا، لیکن ان کی فطرت و جبلت سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے، یہ تو قربانی کے سلسلہ میں ویدوں میں جو بے شمار خرافات رسمیں پھیل گئی تھیں، اور جن سے ان کا دھرم رسموں کا ایک گورکھ دھندا بن گیا تھا، اس کے خلاف

اہنسا کے اصول کا پرچار ایک موثر اصلاحی قدم تھا، اگر آریوں کی فطرت و جبلت ذبح حیوانات کو ناپسند کرتی، تو ان مین قربانی اور اس سلسلہ مین بے شمار رسمون کو مقبولیت سرے سے حاصل ہی نہ ہوتی، اور نہ ان مصلحین کو ان کی اصلاح کی ضرورت پیش آتی، علاوہ ازین کسی خاص مصلحت سے کسی خاص جانور کے ذبح سے دستکش ہو جانا بھی نفس ذبح حیوانات سے جبلۃً انکار کرنے کے مترادف نہین ہے،

علاوہ ازین اگر ہندوستان مین ذبح حیوانات کی ممانعت "خلاف نبوت" نہین تھی تو مولانا کے بقول فقہ حنفی کی تشکیل و تدوین تو آریائی خون اور ذہنیتون کے لحاظ سے آریائی نسل کے مسلمان اکابر کے ہاتھون ہی انجام پائی تھی، اور ان کے بقول فقہ حنفی دراصل ایرانی بائی لاز ہے جو آگے چل کر فارسی بولنے والی قومون کے مرکز دہلی مین اسلام کی ایک مستقل فقہ کی حیثیت سے نمو پذیر ہوئی (ارشاد ولی اللہ اور ان کا فلسفہ ص۱۰۹) اور قرآن کے بین الاقوامی قانون کی حجازی تعبیر عربون کیلئے قومی مذہب تھی اور اس کی حنفی تعبیر عجم کا قومی دین قرار پائی (ص۶۲) اور اسی سبب سے امام ابو حنیفہ معانی ہی کو قرآن سمجھے (ص۶۳) بایں ہمہ ان ایرین نژاد مسلمان فقہا نے اسلام کے اس ایرانی بائی لاز یا عجم کے اس اسلامی "قومی دین" مین بھی جو مرکز دینی مین مدغم ہوا اور احکام نبوت کے خلاف بھی نہ تھا، پھر بھی ذبح حیوانات کو اس فقہ مین بھی ممنوع یا ناپسندیدہ نہین کیا گیا، جب اس ایرانی بائی لاز نے ایرین قومون میں سے ایک بڑی قوم کی جبلت و فطرت تک کا کوئی لحاظ نہین کیا تو آخر کس قسم کی وطنی و نسلی رعایتین اس بائی لاز مین ملحوظ رکھی گئی ہین اگر اس کو ایرانی بائی لاز سے موسوم کیا جائے، مولانا اپنے خیالات کے تولنے کے لئے جو ترازو تیار کرتے ہین ان کے نظریے اس ترازو پر بھی تو پورے نہین اترتے، مولانا کے افکار و خیالات اسی قسم کے خلاف واقعہ و خلاف قیاس تعبیرات کا ایک خوشنما انبار ہے،

اکبر کے متعلق مولانا کا دلچسپ نظریہ ہے وہ اس کے دین الٰہی کے بڑے مداح اور اسکو فکر کی عظیم ترین ہندی تصور فرماتے ہین، دین الٰہی کے مبادی و معتقدات اور اسلام کی تعلیمات مین جو بین تضاد ہے وہ اہل علم سے پوشیدہ نہین، ناقد نے اس کی طرف اشارے کئے ہین نیز اس سلسلہ مین حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کے متعلق جو غلط فہمی پھیلائی گئی تھی، کہ ان کے نزدیک اس کا اقدام عین صواب تھا (ص۲۲۵) اس کے متعلق حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے مقدمہ مین شاہ صاحب کی کتاب انفاس العارفین کے اقتباس کو پیش کرکے اس کا پردہ چاک کیا ہے،

اکبر کے سلسلہ مین مولانا سندھی کے افکار عجب قسم کے تضاد کے حامل ہین، ایک طرف وہ فرماتے ہین :-

"اکبر پہلا مسلمان فرمانروا تھا جس نے اس ملک میں آزاد اسلامی ہندوستانی سلطنت کی بنیاد رکھی، جو نہ ایران کی حلقہ بگوش تھی، اور نہ عثمانی سلاطین کے تابع، یہ مسلمانون کی قیادت مین ہندوستان مین قومی حکومت کی تشکیل تھی، اور اسلام کے اصول و قوانین کے اندر ہندوستانی قومیت اور اس کے تمدن اور تہذیب کو زندہ کرنے کی کوشش" (ص۲۹۳)

پھر اسی سانس مین فرماتے ہین :-

"حکومت کا دین اسلام نہ رہا، اکبر اب صرف مسلمانون کا بادشاہ نہ تھا، بلکہ سارے ہندوستانیون کا فرمانروا تھا، ساری رعایا بادشاہ کی نظر مین یکسان اور مساوی تھی" (صفحہ ۲۹۴)

اب صرف سوال یہ رہ جاتا ہے کہ جس حکومت کا دین اسلام نہ رہا ہو، اور جس کی نظر مین مسلم و غیر مسلم مین کوئی ذاتی امتیاز نہ ہو اس کو آزاد اسلامی ہندوستانی سلطنت (ص۲۹۳، ص۳۰۹، ص۳۱۳) وغیرہ سے کیونکر موسوم کیا گیا، وہ آزاد ہندوستانی سلطنت تو کہی جا سکتی ہو مگر اس پر اسلامی کا انطباق کس حیثیت سے کیا جا سکتا ہو،

اسی سلسلہ مین دوسری دلچسپ بات یہ ہو کہ مولانا کے بقول اکبر کے دین الٰہی کی بنیاد عقیدۂ وحدۃ الوجود کی اصل حقیقت پر ہے (ص۲۹۵) پھر خود ہی ارشاد فرماتے ہین کہ ابن عربی جو مسلمانون مین اس فکر کے بانی اور مبلغ ہین ان کی اپنی زندگی اتباع حدیث کا نمونہ تھی، چنانچہ وہ (ابن عربی) خود فرماتے ہین، کہ ہر حقیقت جو خلاف شریعت ہو گمراہی ہے" (ص۲۹۷)



یہان یہ سوال ہو سکتا ہو کہ اکبر کا دین الٰہی خلاف شریعت تھا، یا نہین؟ اگر خلاف شریعت تھا تو اس فکر کے بانی و مبلغ ابن عربی کے فیصلہ کے مطابق وہ گمراہی قرار پاتا ہو، یعنی انہی کے فلسفہ پر اس کی بنیاد ہو، اور انہی کی نظر مین وہ گمراہی ہے۔

اورنگ زیب کے متعلق مولانا کا خیال ہے کہ اس کی خواہش تھی، کہ

"وہ اس ہندوستانی اسلامی سلطنت کے دائرۂ اثر کو اتنی وسعت دے کہ اس کے اندر خیبر پار کے ملک بھی آجائین اور جن پر بھی اس کا اقتدار ہو اور یہ اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک وہ اپنی حکومت کو اسلامی رنگ نہ دیتا، اور اکبری سیاست کے بارے مین اسلامی دنیا مین جو غلط فہمیان پیدا ہو گئی تھین، ان کو رفع نہ کرتا" (ایضاً ص۳۱۳)

اس طرح غریب اورنگ زیب عالمگیر نے اسلامی آئین و احکام کی جو کچھ پابندی کی اور اپنے حدود حکومت مین شریعت کے نفاذ کے لئے جو قدم اٹھایا، وہ للّٰہیت و اخلاص کے بجائے تمامتر سیاسی حکمت عملی پر مبنی قرار پاتا ہو، اور اکبر کی روش کی جو اس نے مذمت کی وہ اس لئے نہیں کہ اسکے دینی نقطۂ نظر سے ایسا کرنا ضروری تھا بلکہ وہ "غلط فہمیون" کو دور کرکے عالم اسلامی پر قبضہ کرنے کے لئے اپنی فضا کو ساز گار بنانا چاہتا تھا، اور اس کے سیاسی تدبر و دوراندیشی، اور فکر عالی کے پردہ مین اوس کے سر پر یہ سارے بہتان اس لئے تھوپے گئے، کہ اس کے ہاتھون ہندوستان سیاسی و ذہنی ارتقاء کی اس منزل پر پہونچ سکے، کہ وہ ایشیائی ممالک مین بین الاقوامی سیاست کا ایک اہم مرکز بن سکے (ص۳۱۳) لیکن عالمگیر کے ہاتھون ہندوستان کو بین الاقوامی سیاست کا مرکز دکھانے کی کوششون مین خود غریب عالمگیر کے دین و اخلاق کا دامن کس قدر داغدار ہو گیا، اس پر نگاہ نہ جا سکی، اور نہ اس نظریہ کو پایۂ ثبوت تک پہنچانے مین یہ نظر آسکا کہ ایسی حالت مین حکمران و کشور کشا کی حیثیت سے خود عالمگیر کا مرتبہ کس قدر گر جاتا ہے، کہ وہ اپنے ۵۰ سالہ دور حکومت کے باوجود اس مقصد کے حصول مین اس قدر ناکام رہا کہ مغرب مین اپنے حدود حکومت سے باہر کی سرزمین کا ایک چپہ بھی اپنے قبضہ مین نہ لا سکا، بلکہ اپنے خیال کو عمل کا جامہ پہنانے کے لئے ایشیائی حکومتون مین سے کسی ایک حکومت کے حدود مین بھی قدم رکھنے کا حوصلہ نہ کر سکا، اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ صرف ہندوستان کے لئے ایشیائی سلطنتون مین بین الاقوامی مرکزیت کا طغرائے امتیاز حاصل کرنے کے لئے عالمگیر کی ثنا خوانی ہی کے پردے مین اس کے دین، مذہب، سیرت و کردار کو کس قدر مسخ کیا گیا ہو، اور اس مرقع مین اس کی جیسی تصویر اتاری گئی ہے، کیا اس کے عہد کی تاریخ کے پڑھنے والے ایک لمحہ کے لئے بھی اس کو صحیح باور کر سکتے ہین،

لائق ناقد نے اس رسالہ مین مولانا کے اسی قسم کے افکار و خیالات کا جائزہ پوری کامیابی کے ساتھ لیا ہے اور مختلف دینی، کلامی، وتاریخی مسائل و مباحث مین ان کے بے بنیاد نظریون، اور قیاسون، اور غیر صحیح دلیلوں کی نشان دہی کی ہے، امید ہو کہ جن حلقون مین مولانا کے افکار پڑھے گئے ہین، ان مین اس رسالہ کو خاص طور پر مطالعہ مین لایا جائے گا، کہ اہل نظر حقائق کے صحیح سراغ کا ایک اجمالی خاکہ دیکھ لین اور غلطیون کی انہی نشان دہیون پر مولانا کے بے شمار نت نئے افکار اور نظریون کا اجمالی تصور کر سکین اور اسلامی حلقے ان مضرتون کے پھیلنے سے محفوظ رہین، جو ان افکار کی ترویج سے پیدا ہو سکتی ہین،

---

# مطبوعات جدیدہ

**مارننگ نیوز کا عید نمبر** (انگریزی) مرتبہ جناب عبدالرحمن صدیقی صاحب تقطیع بڑی ٹائٹل پیج رنگین و دیدہ زیب، کاغذ کتابت و طباعت بہتر ضخامت ۸۰ صفحے قیمت عہ ملنے کا پتہ، مارننگ نیوز، ۲۵ چورنگی، کلکتہ،

مارننگ نیوز کلکتہ کا روزانہ انگریزی اخبار ہے، جو جناب عبدالرحمن صاحب صدیقی کی ادارت میں کئی سال سے برابر نکل رہا ہے، اور اپنے طرز نگارش اور پالیسی کے لحاظ سے معاصر اخبارون مین امتیازی حیثیت رکھتا ہے، ہر سال عید کے موقع پر اس کا ایک عید نمبر بھی نکلتا ہے، جس مین مختلف قسم کے مفید مضامین ہوتے ہین، چنانچہ اس سال کے عید نمبر مین نہ صرف سیاسی، بلکہ تاریخی، ادبی اور مذہبی مقالات بھی ہین، جن کے لکھنے والے بیشتر ملک کے مشاہیر ہین، نیاز احمد خان صاحب آئی سی، ایس نے جاوید نامہ اقبال کے انفاظ مین "کے عنوان سے جاوید نامہ کی اس تخلیص کو پیش کیا ہے، جو اقبال مرحوم نے گول میز کانفرنس کے موقع پر لندن مین ان کو لکھائی تھی، مضمون نگار کا بیان ہے کہ جاوید نامہ کی تخلیص ختم کرتے وقت اقبال مرحوم کی آنکھون سے آنسو روان ہوگئے، جو دیر تک نہ رک سکے، ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب نے اقبال کے فلسفۂ خودی کی روشنی مین دل نشین انداز سے "شخصیت" پر بحث کی ہے، اخبار کے فاضل اڈیٹر نے محمد علی شاہ وقی چادے استنبول مین اپنی ملاقات کا حال بہت دلچسپ پیرایہ مین بیان کیا ہے، ایک یورپین اہل قلم نے مغربی موسیقی پر مسلمانون کے اثرات بتائے ہین، قاضی عبدالغفار صاحب نے ایک فرانسیسی مصنف کی ایک کتاب سے انگریزی زبان کے کچھ اقتباسات پیش کئے ہین، جس کو چینی مسلمانون کے متعلق بعض تفصیلات معلوم ہوتی ہین، جناب مودود الرحمن صاحب بیرسٹر ایٹ لا نے بنگال کے اردو کے ہندو اور مسلمان شعرا پر ایک اجمالی تبصرہ کرتے ہوئے دعوی کیا ہے کہ بنگال اردو کی خدمت میں کسی دوسرے صوبہ سے پیچھے نہیں رہا، اے اے فیضی صاحب نے اپنے مقالہ "ہندوستانی زبان کا لسانی جائزہ" مین یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ہندوستان کی عام بول چال کے لئے ایک ایسی آسان ہندوستانی زبان ہونی چاہئے جس کے ایک ہزار بنیادی الفاظ ہون، ڈاکٹر محمود حسین نے اپنے مضمون مین ہندوستان کی وہابی تحریک کی اجمالی تاریخ بیان کی ہے، ان خاص مضامین کے علاوہ حیدر آباد، بھوپال، رامپور، بہاولپور، اور پالن پور کی صنعتی و تجارتی ترقیون پر از معلومات مقالات ہین، مجموعی حیثیت سے اس کو صحیح معنون مین عید کا قابل قدر علمی تحفہ کہا جا سکتا ہے،

**رزم نامہ مصور اڈیشن** (انگریزی) مولفہ جناب ام عبداللہ چغتائی صاحب تقطیع اوسط، کاغذ کتابت طباعت بہتر ضخامت ۴۰ صفحے قیمت درج نہیں، ملنے کا پتہ دکن کالج ریسرچ انسٹیٹیوٹ، پونا،

جناب ڈاکٹر عبداللہ صاحب چغتائی (دکن کالج، پونا) کا اسم گرامی ہندوستان کی علمی دنیا مین کافی روشناس ہے، ہندوستان کے اسلامی عہد کا تعمیری آرٹ اور مصوری موصوف کا خاص موضوع ہے، جس پر انگریزی مین برابر ان کے مضامین نکلتے رہتے ہین، ان کا ایک مقالہ مندرجہ بالا عنوان سے دکن کالج ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے جرنل مین شائع ہوا تھا، جو کتاب کی صورت مین زیر نظر ہے، اکبر کے حکم سے مہابھارت کا فارسی ترجمہ رزم نامہ کے نام سے کیا گیا تھا، اور اس کے کئی مصور نسخے بھی اکبر اور اس کے درباریون کی خواہش سے تیار کئے گئے تھے، فاضل مولف نے اس مقالہ مین ان نسخون کی مصوری پر ناقدانہ بحث کی ہے، جو تیموری عہد کی مصوری سے ذوق رکھنے والون کے لئے مفید و دلچسپ ہے، کتاب مین رزم نامہ کی تصویرون کی مختلف پلیٹین بھی دی ہین، مگر کسی وجہ سے تمام پلیٹین شامل نہین ہو سکی ہین اس لئے فاضل مولف نے پلیٹون کی روشنی مین جو تنقیدین کی ہین، ان کو سمجھنے مین جا بجا دقت محسوس ہوتی ہے، "س ع"



جلد ۵۵ ماہ صفر ۱۳۶۴ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۴۵ء عدد ۲

## مضامین



# شذرات

ہندوستان کے مسلمانون مین اسلامی علوم و فنون کی خدمت اور اسلامیات سے متعلق تحقیقات کا ذوق اب خاصہ ترقی کر گیا ہے، اور بہت سے اصحاب علم اور متعدد ادارے اس کام کو انجام دے رہے ہین، لیکن کام کی اہمیت اور وسعت کے لحاظ سے ابھی اس کی رفتار نا کافی ہے، خصوصاً مسلمانون کے علمی و تعلیمی مرکزون مین جہان اصحاب علم کی جماعتین موجود ہین تحقیقاتی ادارون کی بڑی ضرورت ہے، اس کی توقع سب سے زیادہ علی گڈہ سے ہو سکتی تھی، لیکن اس میدان مین اس کا قدم سب سے پیچھے تھا، مگر اب وہان کی فضا بھی بدلنے لگی ہے، اور ادھر چند برسون کے اندر سنجیدہ علمی کامون کی طرف بھی کافی توجہ ہوگئی ہے جس کا ایک مفید نتیجہ انڈین ہسٹاریکل انسٹی ٹیوٹ ہے، اس نے تھوڑی مدت مین متعدد مفید علمی کتابین شائع کین، مجلس مصنفین کے نام سے اردو کی بھی ایک علمی مجلس قائم ہوئی ہے جس کا رسالہ مصنف کئی سال سے علمی و ادبی خدمت انجام دے رہا ہے، مجلس مذکور مین وقتاً فوقتاً مفید مقالات بھی پڑھے جاتے ہین، جو رسالہ مصنف کے علاوہ علحدہ کتابی صورت مین بھی شائع ہوتے رہتے ہین،